عہد گم گشتہ

استاد محبوب نرالے عالم

استاد محبوب نرالے عالم فخر پاکستان رجسٹرڈ ان لمیٹیڈ۔ ایک انتہائی باغ و بہار شخصیت ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں سے بقول ان کے ان کا دوستانہ عاشقانہ یارانہ اور فلسفیانہ رہا ہے استاد فلسفے کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے رہتے ہیں۔ اس لئے جب ٹی وی کے پروگرام آپ جناب میں ان سے فلسفے کی تعریف پوچھی گئی تو انہوں نے پورے ہال کو اس بات پر چیلنج کر دیا کہ ان سے زیادہ کوئی فلسفہ نہیں جانتا۔ پھر جب خود ان سے فلسفے کی تعریف دریافت کی گئی تو انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ فل اور سفا دو مختلف چیزیں ہیں۔ یہ پہلے فل تھا اس کے بعد اس کا سفا ہو گیا۔ سبحان اللہ۔ کیا نکتہ پیدا کیا ہے استاد نے۔ اس لئے جو بھی ان سے واقف ہے وہ انہیں استاد ہی کہتا ہے۔

ابن صفی کے بے شمار کرداروں میں سے یہ واحد زندہ اور متحرک کردار ہیں۔ استاد پوری دنیا کو اپنی رعایا کہتے ہیں۔ کیونکہ بقول ان کے یہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے پڑ پوتے ہیں۔ ان کا خاندانی پس منظر ذرا خود ان کی زبانی سنیئے۔

"ہم مغل ہیں۔ مغلیہ خاندان سے نسبت، واسطہ رشتہ اور تقاضہ ہے ملک اور قوم کی محبت کے ساتھ ساتھ۔ ۱۹۴۴ء کی پیدائش ہے۔ مہر افروز جنگل کی طرف لے کر فرار اور مفرور ہو گئی تھیں۔ ہم بچتے تھے۔ مہر افروز نے کسی خانہ بدوش قبیلے کے سردار کو دے دیا پالنے والے کا نام تھا۔ نادر درانی اور پالنے والی کا نام تھا ظہور ن عالم۔ ان کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لیکن وہ لوگ مجھے مارتے پیٹتے گھسیٹتے اور دھاڑتے بہت تھے۔ جب میری عمر دس سال کی ہوئی۔ سن پر بچپنے کا شباب آیا تو میں نے پوچھا کہ مجھے مارتے کیوں ہو؟ پھر انہوں نے کہا کہ تم میری اولاد نہیں ہو۔ بلکہ مغل خاندان کا سرمایہ دولت، تمنا، تکرار اور فلسفیانہ ہو۔ بس اتنا سننا تھا کہ لکھنؤ بھاگ آئے وہاں چھ ماہ رہے۔ وہاں ریلوائی کے ایک گارڈ ملے۔ بس وہ سمجھ گئے کہ شاہی خاندان کے ہو لہذا تعلیم حاصل کرو۔ لیکن دل نہیں لگا۔ خواب میں پردادا کو دیکھا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے بلا رہے ہیں۔ کلکتہ چلا گیا۔ وہاں فوج میں بھرتی ہو کر رنگون پہنچا۔ پھر بھٹکتا ہوا دادا کے مزار پہ پہنچا۔ وہاں کسی کو نہیں معلوم کہ یہ کس کا مزار ہے لیکن مجھے پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ اس مزار کو دیکھتے ہی میرے سینے میں جوش تعلق اور بے بسی پیدا ہو گیا۔ مزار سے لپٹ

کر رونے لگا۔ آنکھ کھلی تو دامن میں پانچ عدد گلاب کے پھول تھے۔ وہیں داد اکی زمین میں ایک غزل کہی۔ ع

لگتا نہیں طبیعت کہیں میرا اجڑے ہوئے بہار میں
تیرے بغیر میری زندگی نہیں عشق دیار میں

اس گردشِ جہاں میں کس کی بنی ہے۔
ہر شخص روتا ہے عالم ناپائیدار میں۔
ان تمناؤں سے کہو کہیں اور جا کے رہیں۔
بلبل کو کیا سنائیں داستانِ لعل و زار زار میں
نگاہِ یار سے مانگ کر لائے عمر ہزار پانچ دن
دو جستجو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اس موقع پر عقاب کے طاہر مسعود نے دریافت کیا۔" استاد یہ تو چار دن ہوئے پانچواں دن کہاں ہے"۔ اس پر استاد نے ایک انداز سے گردن جھٹک کر جواب دیا۔" پانچواں دن تو میں خود ہوں جو زندہ ہوں"۔

ع محبوب تراپے عالم کی بدنصیبی پر ماتم کرو میرے دوستو
کراچی کی سرزمین پر اپنے کے لئے دو گز زمین نہ ملی
کوچۂ یار میں

اس موقع پر جب دریافت کیا گیا کہ استاد غزل تو آپ نے رنگون میں کہی تھی اور کراچی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر یہ کراچی کا ذکر کہاں سے آگیا تو استاد اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔

اس کے بعد میں کراچی چلا آیا اور یہاں
چنے کی تجارت کرتا رہا۔ کڑک چنے۔ یہ
تو ہوا استاد کا تھوڑا بہت پس منظر۔ جو انہیں
سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اب اسی پس منظر میں
استاد سے عقاب کی گفتگو کا لطف لیجئے۔

عقاب ! اچھا استاد یہ بتایئے آپ نے شاعری
کس عمر سے شروع کی !۔

استاد ! پندرہ برس کی عمر سے۔ ہندوستان
کے ہر علاقے میں جاکر شاعری کی اور اپنا نام
چھوڑ آئے۔ ڈنکے کی چوٹ پر عالم کل
شیدائی سودائی اور تمنائی ہو گیا۔

عقاب ! سبحان اللہ ! کیا زور بیان ہے؟
آپ سے تو شاعروں نے جلنا شروع کر دیا ہوگا؟

استاد ! جلے بھی۔ لیکن اخلاف بھی ہوئے۔
واضح رہے کہ استاد کو مشکل مشکل الفاظ بولنے
کا بے حد شوق ہے۔ اس لئے بعض اوقات
وہ ایسے لفظ بھی بول جاتے ہیں جو صرف استاد
ہی سمجھ سکتے ہیں۔

عقاب ! یہ بتایئے آپ کے کچھ شاگرد بھی
ہیں؟

استاد ! ایک دو۔؟ تقریباً ایک لاکھ
تیرہ ہزار۔

عقاب ”بہت خوب۔ کیا آپ اپنے تمام
شاگردوں کو پہچانتے ہیں؟۔

استاد۔ ”اب کس کس کو یاد کروں۔ بہت
سے زندہ ہیں۔ بہت سے مر گئے۔

عقاب۔ ”چند خاص خاص شاگردوں کے
نام بتائیں۔

استاد۔ ”مشہور تو سب ہی ہیں روش
صدیقی وغیرہ۔

عقاب۔ ”کون کون سے مشہور لوگ آپ
کو جانتے تھے یا جانتے ہیں۔

استاد !۔ ایک دو۔؟ پورا عالم انسانیت
مجھے جانتا ہے۔ خاص طور پر وارثی صاحب
ریڈ کراس والے۔ ابن صفی۔ جنہوں نے بہت
سی کتابوں میں میرا تذکرہ کیا ہے۔ عادل رشید
صاحب۔ مجید لاہوری صاحب، شوکت تھانوی
صاحب۔ ابراہیم جلیس صاحب نازش حیدری
صاحب۔ محمودہ سلطانہ صاحبہ۔ جگر صاحب
سید الطاف حسین صاحب یہ فارسی اور اردو
کے بہت بڑے ادیب تھے۔ ان کے شاگرد
تھے لیاقت علی خان۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر محمود
حسین اور ذاکر حسین صاحب۔ میں نے ذاکر
حسین صاحب سے کہہ دیا تھا کہ آپ ہندوستان
کے صدر ہوں گے۔ تو وہ صدر بن گئے۔ جوش
ملیح آبادی صاحب۔ وغیرہ۔

عقاب :استاد !۔ آپ نے یہ کس طرح بتا
دیا تھا کہ ذاکر حسین صاحب ہندوستان کے صدر

بنیں گے۔

استاد !۔ یہ کون سی مشکل بات ہے۔ جو صدر بننے والا ہوتا ہے۔ اُس کے ماتھے پر تابندہ درخشانی کی لپلوٹ اور چھوٹ ہوتی ہے۔ بس پہچاننے والی نظر چاہیئے۔

عقاب ۔" کوئی اپنا ایسا واقعہ سنائیں جو بہت مزیدار ہو۔

اس پر استاد نے ایک گہری سانس لی اور سگریٹ جلاتے ہوئے چھت کو گھورنے لگے پھر دوبارہ ایک سانس لی اور کنکھارتے ہوئے ہوئے بولے۔

استاد !۔ ایک واقعہ ہو تو بتاؤں۔ ادھر تو ساری زندگانی واردات قدردانی رہی ہے کبھی یہ کیا کبھی وہ کیا۔ بہر حال ایک چھوٹا سا واقعہ معروضِ خدمت ہے۔ وہ عرض کر کے پیش کرتا ہوں۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ اخبار جنگ کے اندر اقبال صفی پوری اور شاعر لکھنوی میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے رہے۔ پھر میں نے اسی اخبار کے اندر چیلنج کیا کہ وہ دونوں میرے شاگرد ہیں اور مجھ سے غزلیں لکھواتے ہیں اگر جھگڑا ختم نہ کیا تو سارے شاعروں کی پول کھول دوں گا۔ پھر کیا کہنا تھا۔ اقبال صفی پوری مہینوں میرے پیچھے ڈانڈا لئے گھومتے رہے۔

عقاب ۔" واہ استاد! یہ تو آپ نے ثواب کا کام کر دکھایا۔

استاد ۔" بس زندگانی اس طرح گذاری ہے۔"

عقاب ۔" استاد !۔ آپ اتنے مشہور آدمی ہیں۔ یہ بتایئے کسی مشہور آدمی نے آپ کی قدر بھی کی۔

عقاب ۔" یہ لو۔ یہ کیا بات ہوئی۔ جدھر سے گزرتا ہوں۔ سب اٹھ کر سلام کرتے ہیں تسلیم کرتے ہیں اور میں سب کو رعایا سمجھ کر برابر سے گذر جاتا ہوں۔ کون ایسا ادیب کون ایسا شاعر کون ایسا فلسفانہ ہے جو مجھ کو نہیں جانتا۔

• عادل رشید نے بمبئی میں ۱۹ کتابیں میرے متعلق لکھیں۔ ابن صفی نے دس بارہ کتابیں لکھیں۔

مجید لاہوری صاحب نے ۱۹۰ کالموں میں میرا ذکر کیا محمودہ سلطانہ صاحبہ نے انجام میں ۹۰ کالم نازش حیدری نے جنگ میں دس کالم۔ شوکت تھانوی نے گیارہ۔ ابراہیم جلیس نے سات کہاں تک گنواؤں۔

ان لوگوں کے علاوہ بڑے بڑے افسروں سے میرا دلِ کشادہ رہا۔ سب لوگ مجھے جانتے تھے۔ ایس ایم توفیق صاحب۔ بڑے نواب صاحب جونا گڑھ سکندر مرزا سے جان پہچان تھی۔ اے ڈی نقوی صاحب سے تعلق تھا غلام محمد صاحب میرے شعر سنا کرتے تھے۔ نُون صاحب سے بھی نسبت رہی۔ گورمانی صاحب سے تعلق تھا۔ آلِ رضا، ہاشم رضا صاحب سب جانتے ہیں۔

ایک مرتبہ مجسٹریٹ صدیقی صاحب مرحوم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ مغل ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میرے پاس کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے۔ میں خود ثبوت ہوں۔

پھر انہوں نے کہا کہ آپ کے دادا لعین بہادر شاہ ظفر نے ایک غزل کہی تھی۔

لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں۔

کیا آپ اس زمین پر غزل کہہ سکتے ہیں۔ غزل تو میرے پاس تھی ہی۔ میں نے سنا دی۔ اس پر وہ سرشارِ الفتِ میخانہ ہو گئے۔ اور مان گئے کہ میں سچا ہوں۔

عقاب۔ یہ بتائیں جوش صاحب سے آپ
کی ملاقات کس طرح ہوئی؟

استاد!۔ بھئی۔ جوش صاحب سے میری
ملاقات ہوئی۔ لیکن ملاقات کے بعد ہی انہوں
نے میرا کباڑا کر دیا۔

عقاب۔ وہ کیسے؟

استاد۔ ٹھہرئیے۔ پہلے پوری حالات باتدبیر
بتاتا ہوں۔ ایک زمانے میں لالو کھیت کے
چوراہے پر ایک ندی کی جھیل بہتی تھی۔ ندی
والے جھیل کے دوسرے کنارے پر جوش صاحب
کی کوٹھی تھی میں چنے فروخت کرتا ہوا اُدھر سے گزر
رہا تھا۔

اس موقع پر استاد نے چنے بیچنے کی زوردار
آواز نکالی۔ "چنے کرارے۔ کڑک۔"
جوش صاحب اُس وقت اپنی کھڑکی کے دریچے
میں تھے انہوں نے ایک آدمی سے کہا کہ یہ جو
صاحب چنے بیچ رہے ہیں انہیں بلا کر لے
آؤ۔ میں گیا اور جب میں ان کے دامن کے
قریب پہنچا تو مجھ سے فرمانے لگے "سائیکل کھڑی
کر دو۔ اور اندر تشریف لے آئیے" جب ان
کے کمرے میں داخل ہوئے تو بڑے اخلاق
محبت سے پیش آئے۔ اور مجھ سے پوچھا کہ
حضرت یہ کام کب سے کرتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ جب سے پاکستان
میں قدم رکھا ہے ذریعہ معاش کی سہولت اور
تقاضہ کی الجھن یہی چنا ہے۔

اس پر جوش صاحب نے کہا کہ آپ تو شاعر
معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے لفظوں سے
شاعری برستی ہے۔ میں نے جواب دیا۔
"برستی نہیں ہنستی ہے۔" پھر جوش صاحب
نے دریافت کیا کہ کوئی غزل وغیرہ کہہ رہے ہیں
میں نے جواب دیا کہ بزم بہزاد کا ایک مشاعرہ
ہو رہا ہے۔ جس کے لئے ایک غزل لکھ رہا ہوں"
"گل بدنی گل بدنی ہے"

میں تو وہاں سے چلا آیا لیکن جوش صاحب
نے میری گل بدنی چرا کر بزم بہزاد کے مشاعرے
میں پڑھ دی۔ میں بیمار ہو گیا تھا اس لئے
نہیں جا سکا۔

پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ جوش صاحب
نے میری چوری کر لی ہے تو میں فوراً ہی غش کھا
کر بے ہوش ہو گیا۔ بہت سے لوگوں نے جوش
صاحب کو ٹیلی فون کیا کہ یہ استادانہ کمزوری کا
برجم نہیں ہے آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے
تھا۔ مجید لاہوری صاحب ابراہیم جلیس صاحب

سب نے لکھا کہ جوش صاحب کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔

لیکن مجھ پر کیا فرق ہوا؟۔ میرا دل تو سمندر کی لہروں میں شاعری کر رہا ہے۔ میرے پاس تمنا ہے، تقاضہ ہے، الفاظ ہیں، سراپا ہے شاعرانہ ہے، فلسفانہ ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک دوسری غزل کہہ ڈالی۔ وہ غزل یہ ہے۔

یہ بھی عالم ہے وہ بھی عالم ہے پیر کی پائل باجے
چھم چھم چھم چھم
کیا گل سفنی گل سفنی گل سفنی ہے
گلوں کے گلستان سے کہو گلشن کا کیا حال ہے
کیا گل ڈفنی گل ڈفنی گل ڈفنی ہے۔

اس غزل کو سن کر نواب صاحب (نواب صبح صادق) آف بہاولپور بہت خوش ہوئے اور مجھے پانچ سو روپے دیئے۔

عقاب۔ استاد۔ جوش صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟

استاد۔ جوش صاحب ہندوستان اور پاکستان کے متفقہ طور پر استاد ہیں۔

عقاب۔ استاد انہیں شاعرِ انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟

استاد:۔ بھئی۔ جب انہوں نے یادوں کی بارات لکھی۔ عشق، حسن، عاشقی، اچھینا، یہ سب لکھا۔ تو یہ سب درجے انقلابی ہیں۔ پینا پلانا۔ ہم ان کی قابلیت کو انقلاب نہیں کہتے۔ جوش صاحب ایک قابلِ تعریف شاعر ہیں۔ لیکن انقلاب الگ ہے۔ شاعری الگ ہے۔ ان دونوں کا آپس میں کوئی شیرازہ نہیں ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر سراپا ہے۔

عقاب۔ اچھا استاد یہ بتائیے۔ جوش صاحب نے جو اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ بے شمار عورتوں نے ان سے محبت کی تو کیا یہ صحیح ہے؟

استاد۔ ہوسکتا ہے۔ خود میں نے جنون عشق کیا تھا۔ دراصل جوش صاحب اور رئیس امروہوی صاحب دونوں عشق اور عاشقی میں رہے۔ جوش صاحب تو ابھی تک کے چلے جا رہے ہیں لیکن رئیس صاحب، درویش بن گئے۔

عقاب۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟۔ جنون عشق۔؟

استاد:۔ جی ہاں۔ زندگانی فراموشیٔ جنون اور جنونیت رہی۔

عقاب۔ سبحان اللہ۔ استاد کسی عشق کا حال سنائیں ایسا عشق جو آپ کو گھائل کر گیا۔

اس بات پر استاد نے دوبارہ ایک سگریٹ
سلگائی۔ اور خوابناک لہجہ میں بولے۔

استاد۔ تو پھر سُن لو۔

بمبئی کے اندر پیرا عالم ہوٹل تھا۔ سستا
زمانہ تھا آمدنی بہت ہوتی تھی۔ روز گانا سننے
جاتے تھے۔ سو دو دو سو روپے بانٹ دیتے
تھے۔ ایک طوائف تھی۔ رسگلّہ نام کیسر عمر
بیس برس ناک نقشہ کچھ مت پوچھئے۔

عقاب: نہیں استاد۔ ناک نقشہ تو ضرور
بتانا ہوگا۔

استاد۔ تو پھر لکھو!۔

اس کی نظر ایسی تھی کہ جس طرف دیکھ
لیتی دیوار بھی شیدا ہو جاتا۔ گول چہرہ آنکھوں
کی پتلیوں میں وہ جھلک۔ وہ چمک۔ وہ کسک
وہ پہلوٹ۔ وہ چھبن وہ چبھن کہ کیا کہنے مسکراتے
ایسی باریک کہ جس سے ڈالیاں بھی جھوم جائیں
گردن صراحی دار سینہ بھرا بھرا۔ کمر لچکدار۔
جب وہ لال ساڑھی پہنتی تھی خراماں خراماں
تو کوئلیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

عقاب۔ کیا کہنے ہیں آپ نے کوئی شعر تو اس کے
لئے کہا ہوگا؟

استاد! یاد نہیں ہے۔

بہرحال میں ابھی ایک شعر آپ کو کہہ کر سناتا
ہوں۔ ہاں تو شعر سنیئے۔"

"آپ کا نام ہے رسگلہ تو نے کیا گل کھلایا کل
کل کے دن میں گیا حلوائی کی دکان پہ لایا رسگلہ

عقاب۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ کیا شعر
ہے۔ اچھا استاد اُس کے بعد کیا ہوا؟۔

استاد: ہم رسگلہ کے ہاں تخشب مرحوم
کے ساتھ گئے تھے۔ کچھ تماش بین اُس کے دائرے
میں بیٹھے تھے۔ مجھ سے کہا تشریف رکھئے۔
ہم ایک تکیہ درِ دیوار کے کونے میں لگا کے
بیٹھ گئے۔ جیسے اُس حسن کو سینے سے لگا کے
بیٹھ گئے۔

تخشب صاحب نے اُس سے فرمایا کہ
یہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ استاد محبوب نرالے
عالم میں نے کہا خاموش رہو۔ کیوں رسوا کرتے
ہو۔ ہاں ایک بات بھول گیا۔ وہ یہ کہ میں اس
وقت نشے میں تھا۔ میں نے نیت شراب
پی رکھی تھی۔

عقاب۔ اور آپ کا حلیہ کیا تھا؟

استاد۔ چوڑی دار پاجامہ۔ کلکتہ کا جوتا
شیروانی، رامپوری ٹوپی اور ہاتھ میں چاقو۔

عقاب۔ چاقو! وہ کس لئے۔

استاد۔ "وہ میری ادا لئے بے خودانہ تھی۔
ہمیشہ چاقو رکھتا تھا۔ خیر۔ ہم دونوں پہلے

ایک دروازے سے گزرے پھر دوسرے دروازے تیسرے دروازے آخر میں آٹھویں دروازے پر رسکلا نظر آئی۔ کمرے میں بیٹھی ہوئی۔ گرمی کا دن تھا۔ پنکھا چل رہا تھا۔ محترمہ کہنے لگی۔ آداب۔

میں نے کہا۔ "پیارد کا تسلیم"

اُس پر اس نے کہا کہ آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔

میں نے جواب دیا۔ "بیگم! دلچسپ تو ہے لیکن دل نہیں ہے دل دے دو تو دلچسپ ہو جاؤں۔" خیر اس کے بعد اُس نے نازک انگلیوں سے میری طرف پان بڑھایا۔ میں نے بجائے پان لینے کے اس کی انگلیوں کو بوسہ دے ڈالا۔ پان کا ٹکڑا گر پڑا۔ دامن کے پڑوس خلاف ہو گئے کہ یہ تہذیب سے گری ہوئی حسن کی شان کے خلاف ہے۔

میں نے کہا شٹ اپ۔ یعنی خاموش رہو۔

مجھ پر ڈبل نشہ تھا۔ ایک تو شراب کا دوسرا حسن کا۔ ایک صاحب نے ایک ہزار روپے کی گڈی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے نظر پھیر کر کھما لیا اور بولنے لگی۔ میں طوائف ہوں۔ سب کی ہوں۔ میری خاطر جھگڑا مت کرو۔ پھر میں نے وہیں کچھ شعر سنائے۔

گو انہیں جب سے جلوہ نما پا رہا ہوں
نقاب اپنی ہستی کی اٹھا رہا ہوں
اے جانے والے ہم سے نہ پوچھ کہ منزل کہاں ہے
اتنا سمجھ لے کہ بس چلا جا رہا ہوں
مجھے کیا مٹائے گی زمانے کی دنیا
میں خود ہی اپنے ہاتھوں سے مٹا جا رہا ہوں

رسکلا نے کہا۔ "یہ غزل مجھے دے دیجئے تاکہ میری روزی کا بندوبست ہو جائے۔" صبح تک سب لوگ چلے گئے تو اس نے پوچھا کہ آپ کیوں نہیں جا رہے۔ میں نے کہا۔ "ہم تمہاری آنکھوں میں بک گئے۔ بول کتنی دولت مانگتی ہے۔

طوائف نے کہا کہ صرف مسکرانے کے ایک ہزار۔

میں نے کہا کہ ایک مہینہ کا پورا خرچ لیا کر۔ خیر پھر کسی طرح وہ رات دلبر بسر رہی۔ اس کا حال سنانا بیکار ہے۔ بس ایک یاد ہے جو چھری بن کر چھا گیا ہے بس اتنا یاد ہے کہ اس نے ہماری کمر میں ہاتھ ڈالا۔ اور بڑے ناز سے مسہری کی طرف لے جا کے دوسرے ہاتھ سے پردہ گرا دیا۔

عقاب۔ استاد! یہ تو بہت دردناک داستان ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کوئی حسن آپ کی نظروں سے گزرا؟

استاد۔ کوئی نہیں۔ سارا حسن اسی تک تھا میں نے دس لاکھ تیرہ عورتیں زندگی میں دیکھی ہیں لیکن اُس جیسا کسی کو نہ پایا۔

عقاب۔ استاد۔ کوئی فلم ایکٹریس اُس جیسی؟

استاد۔ کوئی نہیں۔ کچھ کچھ نرگس میں خوبیاں تھیں۔ (اس موقع پر استاد کو شبنم، زیبا، بابرہ، نجمہ وغیرہ کی تصویریں دکھائی گئیں لیکن استاد نے سب کو ریجیکٹ کر دیا)

عقاب۔ آپ نے کبھی سیاست میں حصہ

لیا ہے ؟

استاد ۔ کبھی نہیں ۔ ایک مرتبہ سیاست کی قبر پر گئے تھے ۔ پھول چڑھانے ۔ وہاں کانٹے بچھے تھے ۔

ہم واپس آ گئے ۔ یہ میری بڑی عمدہ بات ہے اس کو ضرور لکھئے گا ۔ آپ کا انعام مل جائیگا ۔

عقاب ۔ کسی فلسفی سے بھی متاثر ہیں ؟

استاد ۔ کسی سے بھی نہیں ۔ میرے مقابلے پر کوئی نہیں آتا ۔ میں نے اپنی کتاب "بندر کی اولاد" میں چیلنج بھی کر دیا تھا ۔

عقاب ۔ ظاہر ہے ۔ آپ سے کون مقابلہ کر سکتا ہے ؟ خیر استاد ! ۔ آپ نے سیاست میں تو حصہ نہیں لیا لیکن کبھی سیاسی شعر بھی کہا ہے ؟

استاد ۔ کیوں نہیں ۔ ایوب کے زمانے میں بشیر ساربان پر ایک سیاسی غزل کہی تھی ۔ اس کے کچھ شعر سناتا ہوں ۔

آج میری آنکھوں میں دنیا گھوم رہی ہے ۔
آسمان دیکھ رہا اور زمین ناچ رہی ہے
خیالِ منور میں چاندنی کا سایہ ہے
چاند دیکھ رہا اور چاندنی ناچ رہی ہے
محبوب نرالے عالم اس عالم کے صدقے جاؤں ۔
سیاست دیکھ رہا ہے اور فلسفہ ناچ رہی ہے ۔

عقاب ۔ کیا کہنے ہیں ؟ کتنی خوبصورت غزل ہے ۔ یہ بتائیں ۔ آپ نے شاعری کے لئے کتنا کام کیا ہے ۔ ؟

استاد ۔ کیا کچھ نہیں کیا ؟ ۔ پوری زندگانی کو اس پر دستگار کر لیا ۔ ترقی پسند شاعری کا بانی میں ہوں ۔ جدید شاعری کو میں نے ایجاد کیا ۔ اس کے علاوہ بہت سی نئی زبانیں ایجاد کیں ۔ جیسے عربا ، فارسا ، گجراتا ، اردا ۔ اور پنجابا ۔

عقاب ۔ کیا کہنے ہیں ۔ کیا کیا خدمات ہیں آپ کی ؟ خدا آپ کو جزائے خیر دے ۔ اپنی ایجاد کی ہوئی زبان میں کوئی غزل سنائیں ۔

استاد ۔ فارسا میں ایک غزل سنیں ۔

دال خانم دال خانم چے گوی چے کنم چے
الف چے بے نگار دارم ۔
خیال خانم خیال خانم چے گوی چے کنم ۔
کرو چھڈے مکھا سنبھا مانی ۔
جہانِ خانم ، جہانِ خانم چے گوی چے کنم ۔
نگاہ یار کرم نگاہ یار کرم
مستانہ خانم مستانہ خانم چے گوی چے کنم ۔
دل ترا ستا دل ترا ستا لے نرالے ۔
بے گانم بے گانم چے گوی چے کنم ۔

عقاب ۔ سبحان اللہ ۔ کیا زبان ہے ؟ کیا روانی ہے ؟ آپ ہی لوگوں کی وجہ سے ادب زندہ ہے ۔

استاد - ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔
سلیم الدین صاحب نے یہ کہا ہے کہ ادب مرگیا (سلیم احمد کے متعلق فرمار ہے تھے استاد) ادب کبھی نہیں مرتا۔ شخصیت مرتا ہے۔ سرایا مرجاتا ہے۔ سیاست مرجاتا ہے لیکن ادب اور فلسفانہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ کس نے ادب کا جنازہ اٹھایا؟۔ سلیم الدین صاحب ذرا بتائیں تو۔

عقاب۔ آپ نے ٹھیک فرمایا استاد!
سلیم الدین (سلیم احمد) صاحب کبھی نہیں بتا سکتے اردو زبان کے بارے میں کیا کہنا ہے۔

استاد - اردو کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ نہ انگریزی، نہ فارسی، نہ جاپانی نہ افریقی، نہ سندھی اور نہ گجراتی۔
حضرت آدم ؑ نے جنت، میں اردو زبان ہی میں دعا مانگی تھی۔

عقاب - کتنا زبردست انکشاف فرمایا ہے استاد آپ نے اس پر تو تحقیقی مقالے لکھے جائیں گے۔ علامہ اقبال کے بارے میں کیا خیال ہے؟

استاد - بھئی۔ علامہ اقبال چار تھے - اب آپ پتہ نہیں کس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ بہرحال جب علامہ اقبال کی یہ شاعری ہے وہ بہت زبردست شاعر تھے" حقیقت

والے اور بہترین ادیب ہیں۔"

عقاب - استاد! کچھ موسیقی سے بھی واسطہ رہا ہے آپ کو۔؟

استاد - کیوں نہیں کون سا راگ ہے؟ جو زبان آزمائش نہیں ہوا۔ اور میں نے جس میں سکندری کا ڈنکا نہیں بجوایا۔
اس موقع پر استاد نے اپنی ایک غزل باقاعدہ آلاپ کے ساتھ سنائی۔

عقاب - استاد! - آپ تو راگ راگنی جانتے ہیں۔ یہ فرمائیے مہدی حسن کے بارے میں کیا خیال ہے؟

استاد-" بھئی۔ سورج جہاں چڑھ گئی۔ وہاں لازم ہے دھوپ کی گرماہٹ تو ہو گی۔ مہدی حسن کی چڑھ گئی ہے۔

عقاب - اور نور جہاں کے بارے میں۔

استاد - ۱۴ برس کی تھی جب بمبئی آئی تھی۔

عقاب - پھر!

استاد - بس اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔

عقاب۔ آپ نے کچھ کتابیں بھی تو لکھی ہیں۔

استاد - ہاں - بہت سی لکھ لی ہیں بہت سی لکھ رہا ہوں۔

عقاب -" مثلاً۔

استاد -" سنیے۔

مسائل عشق منزل ۔

نرالا مذاق ۔

بندر کی اولاد ۔

یہ دنیا مرغِ دل ۔

دیوانے تاریخِ زمانہ ۔

آنکھ دل کا مقدمہ ۔

عرش کا مشاعرہ ۔

بھارت کا تباہی ۔

ایک پہاڑ کا آگ دبائی ۔

رول کبڑا لا مکان ۔

اس شہر میں ہر شخص پاگل ہے (یہ دراصل ایک رسالہ ہے جو استاد نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں)

لمبے گھوڑے کا قدم ۔

پانچ منٹ کی فروری جنزرس ۔

استاد کے ارشادات ۔

زندگی — ایک کش مکشِ عالم ہے ۔

محبت — جنون اور جنونیت ہے ۔

شاعری — ایک خف ہے جو ذہن کو بڑھاتا ہے ۔

نفرت — موت کا آثار ہے ۔

موت — آخری فنا ہے ۔

عقلمند — سنجیدہ کم بات ۔

عقل — "انسانیت کا زردوزی" ۔

گھامڑ — مہا مہا بے وقوف نالائق ۔

عورت — ایک مہا گھر کی زینت ۔

مقصد — صبح شام ایک ۔

مرد — عورت کی روشنی ۔

خوشبو — چمن سے بلبل لانا ۔

موسیقی — ایک سرگم ہے ۔

ایک دفعہ میں استاد کو اپنے ساتھ فلم اسٹوڈیو لے گیا۔

میرا خیال ہے کہ استاد کے تعارف کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے قارئین کو ان کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ کون ہیں اور کس مزاج کے ہیں۔ ان جیسی شخصیت نرگس کے ہزاروں سال رونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ (یہاں فلم اسٹار نرگس مراد نہیں ہے)

استاد بہت دنوں سے کچھ بجھے بجھے سے تھے۔ میں نے جب ان سے ان کی اداسی کا سبب دریافت کیا تو ایک گہری سانس لے کر بولے "مجھ کو ارتباط فلاڈلفیا ہو گیا ہے۔"

اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ فلاڈلفیا کسی شہر کا نام ہے لیکن یہ ارتباط فلاڈلفیا کیا تھا' یہ صرف استاد ہی جانتے تھے اور استاد سے مزید کچھ معلوم کرنے کی حماقت کرتا تو وہ اسی قسم کی دو چار باتیں اور بول دیتے اور میں سر پیٹتا رہ جاتا اس لیے میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی تھی۔

اس زمانے میں کراچی کے اسٹوڈیو کی رونقیں بحال تھیں۔ فلمیں بنتیں اور لوگ شوق سے فلموں کو دیکھا بھی کرتے تھے۔ فنکاروں سے ملاقات کرنے اور ان سے بات کرنے کی خواہش بھی ہوا کرتی اور اب تو یہ حال ہے کہ فنکار برابر میں آ کر بیٹھ جائے تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کون ہے؟ بلکہ وہ بے چارہ بہانے بہانے سے اپنا تعارف خود ہی کرا دیتا ہے۔ گفتگو

مماثل

تحریر : منظر امام

استاد محبوب نرالے عالم کی بدحواسیاں اور شوخیاں ہمیشہ کسی نہ کسی واقعہ کو جنم دیتی رہی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہر کام میں اپنے نام کی لاج بھی رکھتے ہیں۔ اب ایک عجیب مخمصے میں انھوں نے ایک نامور اور معروف فلمی ہیروئن کو ڈال دیا ہے اور دوسروں کو اپنی صداقت کا یقین دلانے کے لیے اپنے ساتھ ایسے ثبوت بھی لئے پھر رہے ہیں کہ جو چکر بازوں کو بھی چکرا دینے کے لیے بہت خوب ہیں۔

ایک نوجوان حسینہ سے برس ہا برس پوشیدہ تعلقات کی دلچسپ داستان

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کچھ اس قسم کی ہوا کرتی ہے۔

"کیا بتاؤں جناب! کس بلا کی گرمی ہے" فنکار ایک بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"جی ہاں جناب! گرمی تو بہت ہے۔" دوسرا جواب دیتا ہے۔

"اور جناب، اس گرمی میں لوڈ شیڈنگ ایک اور مصیبت ہے۔" فنکار بات آگے بڑھاتا ہے۔ "لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ٹی وی کے پروگرام نکل جاتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی کل خبرنامہ نہیں دیکھ سکا۔"

"میں تو صاحب اپنی سیریل کی چوتھی قسط دیکھنے بیٹھا کہ لائٹ چلی گئی۔"

"اپنی سیریل! اوہ..... تو آپ کیمرا مین ہیں؟"

"نہیں جناب!" فنکار بدمزہ ہو کر کہتا ہے۔ "میں آرٹسٹ ہوں۔ سیریل میں لیڈنگ رول کر رہا ہوں۔ آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔"

تو جناب آج کل فنکاروں کا یہ حال ہے لیکن وہ زمانہ کچھ اور تھا جب فنکاروں کو بہت حیرت اور رشک سے دیکھا جاتا تھا۔ بہرحال میں ایک دن استاد محبوب نرالے عالم جیسے فنکار کو اپنے ساتھ فلم اسٹوڈیو لے گیا۔

گیٹ میں داخل ہوتے ہی استاد کے انداز ہی بدل گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس دن وہاں کوئی رقص وغیرہ فلمایا جارہا تھا جس کے لیے کئی لڑکیاں بلوائی گئی تھیں۔ یہ لڑکیاں رنگین لباسوں میں ملبوس گھومتی پھر رہی تھیں۔

"واہ، یہاں تو درجنوں زربانیں اور زر قلمیں ہیں۔" استاد نے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"استاد آپ جب تک ان لڑکیوں کے دیدار سے خوش ہوتے رہیں، میں ایک منٹ میں آتا ہوں" میں نے کہا۔

استاد کو اس وقت میری کیا پروا ہو سکتی تھی کہ میں کہاں جارہا ہوں اور کیوں جارہا ہوں؟ وہ ان کے لیے "گھوربین" بنے رہے۔ گھوربین استاد کی اپنی اصطلاح ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ سو فیصد درست ہے۔ استاد دوربین کو گھوربین کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس مشین کے ذریعے دور کی چیزیں نہیں دیکھی جاتیں بلکہ عورتوں کو گھورا جاتا ہے۔ اس لیے وہ دوربین کو گھوربین کہا کرتے۔

میری واپسی تقریباً آدھ گھنٹے میں ہوئی اور لان کی صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ ان عورتوں یا لڑکیوں نے چاروں طرف سے استاد کو گھیر رکھا تھا اور استاد ایک وجد اور ترنگ کے عالم میں ان کو اپنی شاعری سنائے جارہے تھے۔

"میں قلزنی تو ہست بود۔ ڈھم ڈھم۔ تیرا چہرہ سکندر اعظم، ڈھم ڈھم۔ تیرے گیسو بالوں کی طرح ڈھم ڈھم۔ فردنما، دردنما، اردنما ہائے بے کسی بے تنی، بے ہنی، بے آ، بے جا، ڈھم ڈھم۔"

استاد کو پروا ہی نہیں تھی کہ سننے والیوں کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ ہنستے ہنستے ان کے چہرے سرخ ہوگئے تھے۔ ان میں سے دو چار پیٹ پکڑ کر گھاس پر لوٹ رہی تھیں۔ دو چار بری طرح چیخ رہی تھیں۔ جیسے ان پر ہسٹریا کے دورے پڑ گئے ہوں۔ غرض استاد نے وہاں ایک ہڑبونگ سی برپا کر دی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر استاد کا بازو تھام لیا "استاد چلیں یہاں سے" میں نے کہا "آپ کو رضوی صاحب بلا رہے ہیں۔"

"خبردار!" استاد نے ایک جلالی کیفیت میں اپنا بازو میری گرفت سے چھڑا لیا "بے مزا جہنم۔ سب سے ہنر، پٹاخ چہ کردی بادر۔"

نہ جانے استاد کیا کہہ گئے تھے؟ میں نے جب دوبارہ استاد کو لے جانا چاہا تو ان میں سے ایک لڑکی نے کہا "یہ آپ ان کو کہاں لے جارہے ہیں، اتنے دنوں کے بعد تو ایک تماشا ہمارے ہاتھ آیا ہے۔"

"سن لیا استاد!" میں نے استاد کو غیرت دلائی "یہ سب تمہیں تماشا سمجھ رہی ہیں۔"

"یہ عالم شادمان وحشت، بے آرام فروغ ہے" استاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

اب خدا جانے استاد کیا کہہ گئے تھے۔ وہ اس وقت اتنی ترنگ میں تھے کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ استاد ان کے ساتھ ہی رقص کا مظاہرہ شروع کر دیتے یا ان میں سے دو چار پر عاشق ہو جاتے۔ استاد کے عشق کا فلسفہ میں بتا چکا ہوں۔ یعنی بقول استاد کے جو سب سے زیادہ نفرت کرے، سب سے زیادہ گالیاں دے، اسی کو اپنا سچا محبوب سمجھو۔ کیونکہ اس کی نفرت جینے کا اور جدوجہد کا حوصلہ دلاتی ہے۔"

یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں استاد کو کس طرح وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں انہیں رضوی صاحب کے کمرے میں لے آیا۔ جہاں استاد کا پہلے ہی تعارف ہو چکا تھا۔ اس وقت رضوی صاحب کے ساتھ کسی فلم اسٹار تہمینہ بھی موجود تھی اور بھی کچھ لوگ تھے۔ استاد کمرے میں داخل ہوئے اور پہلی ہی نگاہ میں انہوں نے گویا سب کو فتح کر لیا۔ انہوں نے کسی اور پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ بلکہ سیدھے تہمینہ کے سامنے جا کر کھڑے ہوئے اور بڑے ادب سے جھک کر

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بولے ''نرخ ارزاں عالم بالا دوبارہ آمد کا شکریہ۔ میں عندلیب مرغ آفریدہ کب سے محوِ طلب و دیدار ساقی ہوں۔''

تہمینہ اس عجیب و غریب زبان کو سن کر گھبرا سی گئی۔ خود میں بھی سٹپٹا گیا تھا۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ استاد کمرے میں داخل ہو کر سلام دعا وغیرہ کریں گے۔ اس کے بعد جا کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمائیں گے لیکن استاد نے کوئی تکلف ہی نہیں کیا تھا۔

''استاد!'' میں نے مجبوراً استاد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید خرافات بولنے سے روکا۔ ''آپ نے شاید انہیں پہچانا نہیں' یہ مشہور فلم اسٹار تہمینہ ہیں۔''

''ہاں' ہاں۔ میں جانتا ہوں'' استاد کا لہجہ بہت خوابناک اور رومانی ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب بہت صاف زبان میں گفتگو فرما رہے تھے ''لیکن تم لوگ نہیں جانتے کہ میرا اور ان کا ساتھ جنم جنم کا ہے۔ یہ پچھلے جنم میں میرے ساتھ رہ چکی ہیں۔''

میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ استاد نے یہ ایک نیا ڈراما شروع کیا تھا۔

''کیا بکواس ہے؟'' تہمینہ بھی بھڑک اٹھی ''بوڑھے انسان' تم یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں اندرونِ خانہ ماہیِ بے آب و بے برتن ہوں'' استاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میں چق مالی ہوں۔ شعلہ رساں و بے ضرر فتنہ ہوں۔ میں اندوختہ اور آموختہ ہوں لیکن جو بھی ہوں' وہ صرف تمہارے لیے ہوں' صرف تمہارے لیے۔''

وہاں ایسی سچویشن ہو گئی کہ خود مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی تھی۔ اب یہی بہتر تھا کہ میں استاد کو کسی طرح یہاں سے لے جاؤں ''چلیں استاد!'' میں نے استاد کا ہاتھ تھام لیا ''وہاں اسٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی ہے' چل کر دیکھتے ہیں۔''

میں نے استاد کا بازو تھاما تھا اور استاد نے تہمینہ کا بازو تھام لیا اور اسے جھنجوڑ کر بولے ''اب بتاؤ' تم نے میرے لیے جو چکن بریانی بنائی تھی' وہ کہاں ہے؟ شریر کہیں کی' بریانی بنائی میرے لیے اور کھلا دی کسی اور کو۔''

''رضوی صاحب! خدا کے لیے مجھے اس پاگل آدمی سے بچائیں'' تہمینہ دہائی دینے لگی تھی۔

''ارے رضوی صاحب کیا بچائیں گے' یہ تو خود چکن بریانی کھا کر بیٹھے ہیں'' استاد نے غصے سے کہا ''نانہجار' سنخیر بے جا' چہار درویش اور چہار مغز۔''

''منظر صاحب!'' اب رضوی صاحب بھی بول پڑے۔

''یہ آپ کس آدمی کو یہاں لے آئے ہیں؟''

''خبردار!'' استاد دہاڑے ''میں آدمی نہیں' قل قلانوس ہوں۔ ارسطالیس ہوں اور ابلاغ عامہ ہوں۔ ایک دن تم لوگ میری بات پر ضرور یقین کرو گے۔ میں اور یہ دونوں پچھلے جنم میں ایک ساتھ رہ چکے ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے اس کا۔ پورا زمانہ بلکہ آفتاب عالم تاب بھی جانتا ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

ان کی اس خوبی سے تو میں بھی واقف تھا۔ وہ چاہے کچھ بھی اوندھی سیدھی حرکتیں کرتے رہیں لیکن جھوٹ بولنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا اور وہ بھی اتنا بڑا جھوٹ کہ وہ فلم اسٹار تہمینہ کو پچھلے جنم میں اپنی محبوبہ کہہ رہے تھے۔ پتا نہیں یہ کیا سلسلہ تھا؟''

''آپ جائیں' یہاں سے باہر چلے جائیں''۔ رضوی صاحب نے کہا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا'' استاد نے اچانک تہمینہ کا پیر تھام لیا ''حسن کی دیوی ملکۂ ذیشان و بہارستانی۔ تم مجھے یوں خوار و زبوں و بدحال و بے مثال نہیں کرسکتیں۔ یاد کرو' تم نے ایک بار سکندر اعظم کے کہنے پر مجھے دھکے دیے تھے۔ یاد کرو

جب میں اور تم فرانما کے تالاب کے کنارے مگرمچھ کھایا کرتے تھے۔''

تہمینہ کا یہ حال تھا کہ وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ رضوی صاحب نے میرا بھی لحاظ نہیں کیا اور کچھ آدمیوں کی مدد سے استاد محبوب کو اسٹوڈیو سے باہر پھنکوا دیا گیا۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ باہر آ گیا تھا۔ ایسی شرمندگی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ استاد نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

باہر آتے ہی میں استاد پر برس پڑا۔''یہ آپ نے کیا حرکت کی تھی استاد۔ اس قسم کی حرکت آپ کو زیب نہیں دیتی۔ آپ نے تو ایسی بے عزتی کروادی ہے کہ میں اب کبھی ان لوگوں کو اپنا منہ نہیں دکھا سکوں گا۔''

''کیا تم بھی مجھے جھوٹا سمجھتے ہو؟'' استاد نے ایک گہری سانس لی''میں تم سے سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ لڑکی پچھلے جنم میں میرے ساتھ تھی' میری محبوبہ رہ چکی ہے۔''

استاد نے یہ جملہ سلیس اردو میں بیان کیا تھا۔ اس لیے میں سمجھ گیا کہ استاد کے سر سے ابھی تک بھوت نہیں اترا ہے۔

''خدا کے واسطے استاد! یہ باتیں رہنے دیں۔ ہم کوئی دیومالائی دور میں نہیں ہیں کہ اگلا اور پچھلا جنم ہمارے سامنے آ جائے۔''

''مت کرو یقین' بوالہوس ونشاط انگیز!'' استاد مجھ پر بھی برس پڑے''لیکن میرے پاس ثبوت ہے۔ میں ایک دن ثبوت دکھا کر رہوں گا۔''

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس' بتائیں؟''

''خاموش۔ میں اس وقت عندلیب چمن زار ہوں'' استاد نے اتنا کہہ کر اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

میں نے استاد کو ان کے دولت کدے تک چھوڑ دیا۔ راستے بھر ہم دونوں کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اب اس وقت تک استاد سے بات نہیں کروں گا جب تک ان کا مزاج ٹھکانے نہیں آ جاتا۔ وہ اس قسم کے تماشے تو کرتے ہی رہتے تھے لیکن اس بار تماشے کی نوبت کچھ اور ہو گئی تھی۔ رضوی صاحب وغیرہ سے میرے بھی تعلقات کے کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہو گیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد استاد کی جانب سے ایک حیرت انگیز اطلاع ملی۔ اطلاع پہنچانے والا ایک مستند شخص تھا۔ اس نے بتایا''ارے صاحب! آپ کے استاد نے کیا غضب کر دیا ہے۔''

''کیوں......کیا ہوا ہے انہیں؟''

''وہ ایسٹرن اسٹوڈیو کے سامنے بھوک ہڑتال کر کے بیٹھ گئے ہیں'' اس نے کہا۔

''کیا!'' میں یہ سن کر واقعی حیران رہ گیا تھا۔''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''آپ خود جا کر دیکھ لیں تو آپ کو یقین آ جائے گا۔''

اور میں استاد کو دیکھنے کے لیے ایسٹرن اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ استاد نے واقعی وہاں ایک تماشا لگا رکھا تھا۔ وہ ایک ٹینٹ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے اور چاروں طرف عجیب وغریب انداز کے بینر نظر آ رہے تھے۔ ایک پر لکھا تھا''تہمینہ کس کی۔ استاد کی۔ استاد کس کے' تہمینہ کے۔''

ایک پلے کارڈ پر درج تھا''موجۂ خلاق محبت زرگاں''۔ دوسرے پر تھا''وہ میرے پچھلے جنم کی یتیم وبسیر و باتمکین تھی'' تیسرے پر یہ مطالبہ تھا''نگاہ لطف وکرم عنایت نہ ہوئی تو بندہ خوشاب وخوراب کو جان فرتن کر دے گا'' پتا نہیں یہ کیا لکھوا دیا تھا انہوں نے۔ بہر حال ان کے چاروں طرف اسی قسم کی چیزیں تھیں اور وہ ان کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آس پاس کے لونڈے لپاڑے بھی اس تفریح میں دل کھول کر حصہ لے رہے تھے۔ استاد کی صورت میں انہیں ایک مزے دار چیز مل گئی تھی۔

مجھے دیکھ کر استاد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا''استاد! یہ کیا ڈراما ہے؟'' میں نے پوچھا''یہ آپ کیا کر رہے ہیں' کیا تماشا ہے یہ؟''

''تم کو تو معلوم ہے کہ وہ جادوگر قتالۂ عالم' دوشیزۂ بردوش وسبک سر میری محبوبہ رہ چکی ہے''۔ استاد نے اسٹارٹ لے لیا۔

''کیا بکواس ہے'' میں نے استاد کو کچھ اور بولنے سے روک دیا''آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ پر مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔ پولیس آپ کو گرفتار بھی کر سکتی ہے۔ آپ خواہ مخواہ کسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''

''خوامخواہ نہیں۔ میرے پاس ثبوت بھی ہے'' استاد نے وہی پرانی بات دہرائی۔

''آخر کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''یہ قیدن ملاحظہ چشم ماروشن'' استاد نے اتنا کہتے ہوئے کچھ تصویریں میرے ہاتھ پر رکھ دیں''خود دیکھ لو۔''

وہ بہت پرانی تصویریں تھیں بلیک اینڈ وائٹ۔ جن میں زردی جھلکنے لگی تھی۔ ایک دو جگہ سے وہ خستہ ہو کر ٹوٹ بھی چکی تھیں لیکن ان تصویروں کو دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ بلاشبہ استاد ہی کی تصویریں تھیں۔ یعنی اس وقت کی جب آتش

WAQAR AZEEM
www.pakistanpoint.com

بت پرستی

عربوں میں بتوں کو لانے والا آدمی عمر بن لحی تھا یہ خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ ایک مرتبہ یہ بیمار ہوگیا تو کسی نے اس سے کہا کہ شام کی سرزمین بلقا کے نزدیک ایک چشمہ ہے، اگر وہاں جا کر نہائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔ جب یہ وہاں گیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ اس نے پوچھا یہ کیا ہیں تو لوگوں نے اس کو بتایا کہ ان بتوں سے ہم بارش پاتے ہیں، اپنے دشمن پر غالب رہتے ہیں۔ عمر بن لحی ان سے کچھ بت مانگ کر لایا اور ان کو لا کر خانہ کعبہ میں نصب کر دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مجھے جہنم کا نظارہ کرایا گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک پستہ قد، سرخ رنگ کا مرنجاں مرنج انسان ہے اور آگ کے اندر اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا ہے میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے تو مجھے بتایا گیا کہ یہی عمر بن لحی ہے جس نے عربوں کو بت پرستی کی طرف بلایا اور اس سرزمین پر بحیرہ صیلہ سا قبہ عامی کی رسومات نکالیں عمر بن لحی ایک کاہن تھا۔ اس کی کنیت ابو شامہ تھی ایک جن ابو شامہ کا موکل تھا۔ ابلیس نے اس جن کو استعمال کیا ابلیس کی ترغیب پر اس موکل جن نے ابو شامہ کو مخاطب کر کے کہا ''اے ابو شامہ اٹھ تہامہ کو کوچ کر اپنے آپ کو سعد سلامہ پہنچا پھر جدہ کے کنارے جا وہاں تجھے ریت کے نیچے دفن مورتیاں ملیں گی، انہیں نکال کر تہامہ لا۔ اپنے سرداروں سے خوف نہ کھا۔ اس کے بعد اہلِ عرب کو ان بتوں کی دعوت دے۔'' ابو شامہ اپنے موکل جن کی وجہ سے حرکت میں آیا۔ حج کے موقع پر اس نے لوگوں کو بتوں کی پوجا کرنے کی دعوت دی۔ عرب کے سرداروں نے اس کو قبول کیا۔

اس طرح عمر بن لحی نے ابلیس کی بے انتہا مدد کی۔ وہ تمام بت جو حضرت نوحؑ کے سیلاب میں گم ہو گئے تھے پھر کارآمد ہو گئے۔ شیطان ان کے ذریعے ان گنت لوگوں کو شرک میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوا۔ شیطان نے کہا ''عمر بن لحی بڑا کام کا آدمی تھا خود تو دنیا سے کوچ کر گیا لیکن اس کے بوئے بیج کا پودا اب بھی سرسبز و شاداب ہے۔''

ماخوذ: (فرار تلبیسی ابلیس علامہ ابن جوزی)

مرسلہ: مشرف حسین ندیم، لیاقت پور

جوان تھا۔ استاد کی داڑھی بھی نہیں تھی۔ وہ بالکل بانکے بنے ہوئے کھڑے تھے اور ان کے ساتھ ہر تصویر میں تہمینہ تھی، ہاں وہی تہمینہ۔ وہی فلم اسٹار، جس کو دیکھ کر استاد اپنی پچھلے جنم کی محبوبہ پکار اٹھے تھے۔ سو فیصد وہی، اس میں کسی قسم کا شبہ ہی نہیں تھا۔ وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی قد۔ وہی دل کشی سب کچھ وہی۔ خدا جانے یہ کیسا بھید تھا۔ میں تو واقعی ان تصویروں کو دیکھ کر چکرا گیا تھا۔

''دیکھا، میں دروغ برگردن راوی تو نہیں ہوں نا؟'' استاد نے معصومیت سے پوچھا ''یہ وہی لڑکی ہے یا نہیں؟''

''پتا نہیں۔ میں تو پاگل ہو رہا ہوں یہ سب دیکھ کر'' میں نے کہا۔ ''یہ بھید میری سمجھ سے باہر ہے۔ چلیں مان لیا کہ یہ آپ ہی کی محبوبہ ہے۔ پھر بھی آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''تو اور کیا کروں۔ میرے پاس براہِ راست راستۂ سنگ منزل کون ہے؟''

''جناب! ذرا بات سنیں'' کسی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ سامنے رضوی صاحب اپنے دفتر کے دو چار آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور بے حد غصے میں نظر آ رہے تھے۔

''آپ ذرا میری بات سن لیں۔'' مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ بہر حال میں شرمندہ سا ان کے پاس پہنچ گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' رضوی صاحب غصے سے بولے ''اس شخص نے یہ کیسا تماشا لگا رکھا ہے۔ تہمینہ پر دورے پڑنے لگے ہیں اور میں اب پولیس کو فون کرنے والا ہوں۔''

''نہیں رضوی صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''استاد کا بھی کہنا غلط نہیں ہے۔ میں وہ ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔''

''کیا بکواس ہے۔ کس ثبوت کی بات کر رہے ہیں؟''

پھر میں نے تہمینہ اور استاد کی تصویروں کے بارے میں بتایا تو خود رضوی صاحب کے بھی ہوش اڑ گئے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ میں ان کے اطمینان کے لیے استاد سے تصویریں مانگ کر لے آیا۔ تصویروں کو دیکھ کر ان کو چکر آنے لگا تھا ''کیا ہے یہ سب۔ یہ تو واقعی تہمینہ کی تصویریں ہیں۔''

''وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ استاد نے یہ ڈراما یوں ہی نہیں کیا۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہے۔ کوئی ایسی بات ہے جو فی الحال ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اس وقت ہم یہ کر سکتے ہیں کہ کسی طرح استاد کو اندر لے جائیں۔ وہاں

تفصیل سے باتیں ہوں تاکہ فوری طور پر یہ تماشا تو ختم ہو۔''

''ٹھیک ہے' آپ انہیں اندر لے آئیں۔''

میں نے استاد کے پاس جا کر ان سے کہا ''استاد! آپ کو اندر چلنا ہوگا۔ تہمینہ نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

استاد کی باچھیں کھل اٹھیں۔ انہوں نے اسی وقت بھوک ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پبلک کے سامنے ایک عدد تقریر بھی کر ڈالی۔ ان کی تقریر عشق اور حسن کے فلسفے پر تھی۔ اور محبت میں صبر کی اہمیت بیان کی گئی تھی۔ استاد کی تقریر کچھ اس انداز کی تھی ''میرے ہم وطنو! افلافیا کے رہنے والو! باشندگان گور و کنار یہ عشق مشک ہے۔ آتش ہے' نمرود ہے' قالین ہے۔ بستر ہے اور تبرک ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم مضبوط و دوام رہیں اور بقا کر لیں فنا کر لیں۔ اتنا عشق کریں کہ سمندر خشک ہو جائے اور یہ جوانی ہی سب کچھ ہے۔ جیسے تہمینہ اور جا ہے روزینہ۔ مثال ابرق بے طوق ہوں۔ گفتنی فیل تمن اور چقماق کی قسم۔ میں نے عشق کیا اور منزل مقصود گنجینۂ مراد بے پیر ہو گیا۔''

پتا نہیں لوگوں نے کتنی بات سمجھی اور کتنی نہیں سمجھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ سب ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ استاد نے وہیں پر بھوک ہڑتال ختم ہونے کی خوشی میں دو عدد بن کباب کھائے۔ دو گلاس مالٹے کا جوس پیا اور میرے ساتھ اسٹوڈیو کی طرف ایک نئے معرکے کے لیے چل پڑے۔

مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن استاد کو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ تہمینہ نے انہیں طلب کیا تھا۔

رضوی صاحب کے کمرے میں تہمینہ شعلۂ جوالا بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ استاد کو دیکھتے ہی بھڑک اٹھی ''تم...... دو کوڑی کے انسان۔ تم نے مجھے بدنام کر کے رکھ دیا۔ میری عزت خاک میں ملا دی۔ تم نے میری ساکھ برباد کر دی۔ تماشا بنا دیا ہے مجھے۔ میں تمہیں گرفتار کروا دوں گی۔'' وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا بولتی رہی تھی۔

میں نے اور رضوی صاحب نے بڑی مشکلوں سے اسے خاموش کرایا تھا۔

''دیکھو اے حسینۂ عالم اور قتال بازیگر'' اب استاد نے بولنا شروع کیا ''تم پچھلے جنم میں میرے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں مارکو پولو کے ساتھ ملتان گئے تھے۔''

''بند کرو یہ بکواس۔'' تہمینہ چیخ پڑی۔

اس پر استاد نے وہی تصویریں نکال کر سامنے کر دیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر خود تہمینہ کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔

''یہ...... یہ...... جھوٹ ہے'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''میں تو اس مسخرے کو جانتی بھی نہیں۔ میں اس کے ساتھ تصویریں کیسے اترواؤں گی۔''

''یہ اپنے پچھلے جنم کی بات کر رہے ہیں تہمینہ!'' میں نے کہا۔

''ارے جہنم میں گیا پچھلا جنم'' وہ جھلا کر بولی ''یہ شخص فراڈ ہے' جھوٹا ہے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

''تم یہ بتاؤ' یہ تصویریں تمہاری ہیں یا نہیں؟'' رضوی صاحب نے پوچھا۔

''ہاں' یہ تو' یہ تو بالکل میری تصویریں ہیں'' وہ بوکھلا کر بولی۔ ''لیکن میں نے اس کے ساتھ تصویریں نہیں کھنچوائیں اور یہ تو بہت پرانی تصویریں ہیں۔''

''اسی لیے تو میں پچھلے جنم کی بات کر رہا ہوں'' استاد نے کہا ''یہ معاملہ پچھلے جنم کا ہے' تم یاد کرو...... اپنی یادداشت بے ہنگام پر لائق بھروسا کرو۔ مہمیز شب کو سورج کے ساتھ ملا دو۔ افکر کو اژدہا سمجھو تو پھر سب کچھ یاد آ جائے گا۔''

''میرے خدا! میں تو پاگل ہو جاؤں گی'' تہمینہ اپنا سر تھام کر بیٹھ گئی۔

اس زمانے میں جعلی تصویروں کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ استاد کے پاس بالکل اصل تصویریں تھیں۔ ان میں کوئی کھوٹ نہیں تھی لیکن یہ سب کچھ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ اس وقت استاد کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ تھی جو میدان مار لینے کے بعد فاتح کے ہونٹوں پر ہوتی ہے۔

''تہمینہ! تمہاری کوئی جڑواں بہن تو نہیں تھی'' میں نے پوچھا ''جیسا فلموں میں ہوا کرتا ہے؟''

''ہرگز نہیں'' اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی ''اگر کوئی ہوتی بھی تو اس تصویر کے لحاظ سے میری عمر سترّ برس کی ہونی چاہیے تھی۔''

یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ وہ تصویریں واقعی بہت پرانی تھیں لیکن تہمینہ کے خدوخال صاف پہچانے جا رہے تھے۔ اس میں کوئی دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔

''اچھا فرض کریں یہ پچھلے جنم میں آپ کی محبوبہ تھی تو اب آپ کیا چاہتے ہیں۔ اب تو وہ جنم ختم ہو گیا۔ اب تو یہ کوئی اور دور ہے۔''

''اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا'' استاد نے کہا۔

''یہ وعدہ اس نے افلاطوش کے سامنے کیا تھا لیکن وعدے کے بعد یہ غائب ہو گئی۔ اور اب ملی ہے اسی لیے اس کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔''

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

''کیا دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا؟'' تہمینہ بھڑک اٹھی ''میں تم جیسے جھڑوس سے شادی کروں گی؟''

''میں کچھ نہیں جانتا'' استاد اڑے ہوئے تھے ''اگر تم نے ایفائے وعدہ عہد و پیمان مرتب نہیں کیا تو میں پوری دنیا کو بتا دوں گا۔ تمہاری یہ تصویریں برسرِ روزگار ہو جائیں گی۔''

شاید استاد برسرِ عام کہنا چاہتے ہوں گے لیکن برسرِ روزگار کہہ گئے تھے۔

''کیا واقعی یہ پچھلا جنم وغیرہ کچھ ہوا کرتا ہے؟'' رضوی صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں نے بھی اس بارے میں سن رکھا ہے'' میں نے جواب دیا ''لیکن قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میرا صرف ایک ہی جنم ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تہمینہ کے ساتھ ایسا ہی ہو۔''

''یہ بکواس ہے'' تہمینہ بول پڑی ''اگر کوئی ایسی بات ہے تو کچھ مجھے بھی یاد آنا چاہیے تھا۔ میں نے اس قسم کی فلمیں دیکھ رکھی ہیں لیکن مجھے تو کچھ یاد نہیں آ رہا اور اگر فرض کریں مجھے یاد بھی آ گیا' میں پچھلے جنم میں بدقسمتی سے اس آدمی کے ساتھ بھی تھی تو اس جنم میں پاگل نہیں ہو گئی ہوں جو اس جیسے شخص کی محبوبہ کہلاؤں۔''

کچھ عجیب دلچسپ اور مضحکہ خیز سی صورتِ حال ہو رہی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ایسا تماشا کبھی پیش نہیں آیا ہوگا لیکن استاد کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ جہاں جاتے ہنگامہ برپا کر دیتے۔ اس قسم کی صورتِ حال ان کے ساتھ ساتھ چلا کرتی تھی۔ استاد زندہ باد! انہوں نے تہمینہ اور رضوی صاحب کے چھکے چھڑا دیے تھے۔

''دیکھو بھائی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس بے چاری کا پیچھا چھوڑ دو'' رضوی صاحب نے کہا ''بھول جاؤ کہ پچھلے جنم میں کیا ہوا تھا۔ تمہاری ان حرکتوں کی وجہ سے میری فلم کا نقصان ہو جائے گا۔ ذرا خیال کرو' کچھ لے دے کر معاملہ رفع دفع کرو۔''

''کیا تم نے مجھے اسپغول بے جان سمجھ رکھا ہے؟'' استاد دہاڑے۔

''ایک تو اس کی زبان اپنی سمجھ میں نہیں آتی'' رضوی صاحب نے بے بسی سے میری طرف دیکھا ''نہ جانے کیا' کیا بولتا ہے۔''

''میں آسان تشریح کو سلیس بھی کر سکتا ہوں'' استاد نے کہا ''لیکن شرط مدام یہ ہے کہ اس کو پچھلی باتیں یاد آ جائیں' یہ اقرار کرلے پھر جس طرح میں پچھلے جنم میں بے آب و گیاہ ہو کر واپس چلا گیا تھا۔ اسی طرح آج بھی ہو جاؤں گا۔''

''لیکن میں یاد کیا کروں؟'' تہمینہ پریشان ہو کر بولی ''مجھے تو کچھ یاد ہی نہیں آ رہا۔''

یہ ایک دلچسپ لیکن سنجیدہ کیس تھا۔ میں نے اور رضوی صاحب نے اس موضوع پر بہت سوچا۔ اب ہمیں بھی یہ گمان ہونے لگا تھا کہ یہ کہیں واقعی جنم وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے۔ استاد کی خود اعتمادی اور ان تصویروں سے تو یہی بات ظاہر ہو رہی تھی۔ رضوی صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ ان کے ذہن میں فوری طور پر ایک بات آ گئی ''یار۔ کیوں نہ تہمینہ کی تحلیلِ نفسی کرا دی جائے۔'' انہوں نے کہا ''ایک ماہرِ نفسیات میرے دوست ہیں۔ وہ تہمینہ کی یادداشت کرید کرید کر رکھ دیں گے اور اگر ایسا ہو گیا تو خود سوچو' کیا دھانسو سبجیکٹ ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ بالکل سچا واقعہ' اس کی خوب پبلسٹی کرائی جائے پھر اس موضوع پر فلم بنا دی جائے۔''

تہمینہ کو جب اس تحلیلِ نفسی کی تجویز کا علم ہوا تو وہ غصے سے بھڑک اٹھی ''کیا سب کے سب پاگل ہو گئے ہو جو ایک پاگل کی باتوں میں آ گئے۔''

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے تہمینہ'' رضوی صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ''یہ سمجھ لو کہ یہ تمہاری زندگی کا

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ایک شاندار ایڈونچر ہوگا۔ ایک نیا تجربہ ہوگا تمہارے لیے اور فرض کرو اگر اس شخص کی بات سچ نکلی تو یہ ایک سنسنی خیز بات ہوگی۔ پوری دنیا تم سے واقف ہو جائے گی۔''

''کیا پچھلے جنم میں، میں اندھی تھی یا میرا دماغ خراب ہوگیا تھا جو ایسے شخص سے محبت کرنے لگی۔''

''اب کیا بتایا جائے، اب یہ بھید تو تحلیلِ نفسی ہی کے ذریعے سامنے آئے گا۔''

بہرحال بہت مشکلوں سے رضوی صاحب نے تہمینہ کو اس بات پر راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ اپنی تحلیلِ نفسی کروالے۔ استاد بھی اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے ایک مطالبہ بھی کر دیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اس موقع پر وہ خود بھی موجود ہوں گے۔ انہوں نے کہا ''میں اس قتالۂ بے مہر کو آمادۂ استحقاق کر دوں گا۔ جو کچھ میں یاد دلا سکتا ہوں۔ وہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں اس کے جنم جنم کا ساتھی ہوں، باراتی ہوں اور نباتاتی ہوں۔''

استاد کی اس دلیل میں وزن تھا۔ اس لیے ان کی یہ بات مان لی گئی کہ اس تاریخی موقع پر وہ خود بھی وہیں موجود ہوں گے۔ جس ماہرِ نفسیات کو یہ کام کرنا تھا، ان کا نام کامران مرزا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور نفسیات داں تھے لیکن یہ کیس ان کے لیے بھی پیچیدہ اور حیرت انگیز تھا۔

اس تماشے میں سب سے بری حالت تہمینہ کی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو استاد کا گلا گھونٹ دیتی لیکن مجبور ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے برعکس استاد بالکل پُرسکون تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے آدھی جنگ جیت لی ہے اور آدھی تحلیلِ نفسی کے بعد جیت لیں گے۔

بہرحال ہم سب ایک بڑے تماشے کے لیے ڈاکٹر کامران مرزا کے پاس پہنچ گئے۔ ان کو بھی استاد اور تہمینہ کی تصویریں دکھائی گئیں جن کو دیکھ کر ان کو غش آنے لگا تھا۔ پھر ایک کمرے میں ہم سب جمع ہوئے۔ تہمینہ کو ایک آرام دہ کاؤچ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں، استاد اور رضوی صاحب اس کمرے میں موجود تھے۔

''اب میں تم پر مصنوعی نیند طاری کروں گا۔'' کامران مرزا نے تہمینہ سے کہا ''اس کو ہپناٹزم بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نیند کے عالم میں تمہارا لاشعور آزاد ہو جائے گا اور تم میرے یا اس شخص کے حوالوں کے جواب دوگی۔ تمہارا شعور یا لاشعور کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ بیان کر دے گا۔ تم سے اس نیند کے عالم میں غیر اخلاقی سوالات نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی تم ان کے جواب کی پابند ہوگی، کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے'' تہمینہ نے اپنی گردن ہلا دی۔

پھر ڈاکٹر کامران مرزا نے اپنا تنویمی عمل شروع کر دیا۔ وہ واقعی اس فیلڈ کے ماہر انسان تھے۔ ذرا سی دیر میں تہمینہ گہری نیند میں تھی۔

''تم سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو جس کا نام استاد محبوب نرالے عالم ہے؟''

''نہیں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

''ایک دو برس پیچھے جاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ اس زمانے میں ملاقات ہوئی ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ یہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔''

''کچھ اور پیچھے جاؤ۔ پانچ دس برس۔ اب یاد کرنے کی کوشش کرو۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ اپنے بچپن میں چلی جاؤ۔ جب بہت سے چہرے تمہارے لیے ناآشنا تھے۔ یاد کرو، ہوسکتا ہے کہ اس وقت یہ شخص تم سے ملا ہو؟''

''میں اپنے بچپن میں ہوں۔ بہت سے لوگ میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ بہت سے چہرے لیکن ان میں یہ نہیں ہے بالکل نہیں۔''

''اچھا'' اب تم اپنے بچپن سے بھی پیچھے چلی جاؤ، اپنے پچھلے جنم میں۔''

''اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں ہے وہاں۔ میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں محسوس کر رہی۔''

''یاد کرو'' اب استاد بول پڑے ''پچھلے جنم میں تمہارا نام زرخانہ تھا۔ تم ادغام مملکت ناجنیر سے تعلق رکھتی تھیں۔''

''ایک تو یہ شخص اتنی عجیب زبان بولتا ہے کہ اچھا خاصا شخص پاگل ہو کر رہ جائے۔'' کامران مرزا نے جھلا کر کہا۔

''استاد۔ تم اپنی قابلیت رہنے دو'' میں نے استاد کے شانے پر تھپکی دی ''یہ نازک معاملہ ہے۔ تمہاری جناتی زبان سے تہمینہ کا دماغی توازن بھی خراب ہوسکتا ہے۔''

''تو پھر کس طرح مدعائے اظہار کروں؟'' استاد نے بے بسی ظاہر کی۔

''آسان بات کرو'' میں نے کہا ''اس بدنصیب کو کچھ یاد بھی دلانا ہے تو آسان الفاظ میں یاد دلاؤ۔''

''دیکھو تہمینہ!'' استاد نے اسے مخاطب کیا ''ہم دونوں فراعون کے زمانے میں لاہور میں تھے۔ ایک بار ملتان بھی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

گئے تھے۔ ہم نے گوالیار میں تصویریں کھنچوائی تھیں‘‘ استاد نہ جانے کیا کیا بولنے لگے تھے۔

اور ہم لوگوں کا یہ حال تھا کہ ہم ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جارہے تھے۔ استاد کی باتیں بھی ایسی تھیں کہ انہوں نے ہمیں ہنسا ہنسا کر بے حال کردیا۔ کامران مرزا بھی پیٹ پکڑ کر ہنسے جارہے تھے۔ ایسے لوگ ان کے پاس پہلی بار آئے ہوں گے۔ لیکن استاد کی ہر بات کے جواب میں وہ صرف یہی کہہ رہی تھی کہ اندھیرا‘ صرف اندھیرا‘ اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

’’اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے ساتھ پچھلے جنم وغیرہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے‘‘ کامران مرزا نے بالآخر اعلان کردیا ’’جو کچھ بھی ہے‘ بس اتفاق ہے۔‘‘

’’آپ اس کو ہوش میں لائیں تو پھر بتاتا ہوں‘‘ استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کامران مرزا نے تہمینہ کو نیند سے بیدار کردیا تھا۔

’’ہاں‘ اب بتاؤ استاد! یہ کیا سلسلہ ہے‘‘ ہم سب نے استاد کی طرف دیکھا۔

’’سلسلہ یہ ہے کہ اس بے چاری کے ساتھ واقعی کوئی پچھلا جنم نہیں ہے‘‘ استاد نے کہا۔

’’کیا!‘‘ ہم سبھوں پر جیسے بجلی گر پڑی تھی ’’تو پھر یہ سب کیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا ’’تمہارے پاس تہمینہ کی جعلی تصویریں کہاں سے آگئیں؟‘‘

’’یہ تصویریں جعلی نہیں ہیں بلکہ تہمینہ کی ماں کی ہیں‘‘ استاد نے انکشاف کیا۔

پھر استاد کی زبانی جو کہانی ہمیں معلوم ہوئی۔ وہ اچھی خاصی دلچسپ کہانی تھی۔

تہمینہ کی ماں کسی زمانے میں کوٹھے پر گایا کرتی تھی۔ تہمینہ اس وقت صرف چھ ماہ کی تھی۔ ایک دن استاد نے اسے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہوگئے۔ استاد اس زمانے میں بہت رنگین مزاج ہوا کرتے تھے۔ رنگین مزاج تو وہ اب بھی تھے لیکن اس رنگین مزاجی کو ان کی ناقابلِ فہم زبان نے تباہ کردیا تھا۔ تو ہوا یہ کہ تہمینہ کی ماں بھی استاد کا دم بھرنے لگی اور وہ دونوں کچھ دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ وہ تصویریں اسی زمانے کی یادگار تھیں۔ پھر وقت نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کردیا۔ استاد کہیں اور چلے گئے۔ تہمینہ کی ماں کہیں اور۔ اور ایک دن اس کا انتقال ہوگیا۔

پھر تہمینہ بڑی ہوکر فلم انڈسٹری میں آگئی۔ ماں کی موت کے وقت اس کی عمر صرف تین برس کی تھی۔ اس لیے اسے اپنی ماں کے خدوخال بھی یاد نہیں رہے تھے اور اس کے پاس ماں کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی لیکن یہ اتفاق تھا کہ وہ بالکل اپنی ماں کی ہم شکل تھی۔ لیکن اسے خود اس بات کا احساس نہیں تھا۔ زمانے نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتی پھری تھی۔ پھر کسی نے اس کی پرورش کی اور بڑی ہوکر اس نے فلم انڈسٹری جوائن کرلی۔

ایک بار استاد نے کسی شوٹنگ کے دوران میں اس کو دیکھ لیا۔ وہ دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ یہ روزینہ کی بیٹی ہے۔ وہ اس کے پاس گئے لیکن تہمینہ پر کامیابی کا بھوت سوار ہورہا تھا۔ اس نے استاد کی بات ہی نہیں سنی اور اسے جھڑک کر اپنے پاس سے ہٹادیا۔ پھر وہ اس بات کو اور استاد کو بھول بھی گئی تھی۔

استاد بھنّا کر رہ گئے تھے۔ انہوں نے اسی وقت قسم کھالی تھی کہ وہ اس توہین کا ضرور بدلہ لیں گے۔ حالانکہ یہ سب کچھ استاد کے مزاج کے خلاف تھا۔ لیکن جب سنک سوار ہوجائے تو پھر کون سوچتا ہے اور استاد پر بھی سنک سوار ہوگئی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ عظیم الشان تماشا کرڈالا۔

یہ اتفاق تھا کہ میں استاد کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے گیا۔ جہاں تہمینہ سے اس کی ملاقات ہوئی اور استاد نے اپنے ڈرامے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھالیا۔ انہوں نے جب اپنی کہانی ختم کی تو ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔

’’آپ نے تو کمال کردیا استاد‘‘ میں نے کہا ’’پوری فلم انڈسٹری کو ہلا کر رکھ دیا۔‘‘

تہمینہ اس وقت بالکل خاموش تھی۔ شاید اسے اپنی ماں یاد آنے لگی تھی۔ وہ ماں جو بالکل اسی کی طرح تھی اور جس کو تہمینہ نے بہت پہلے کھودیا تھا۔ جس کے دھندلے سے نقوش بھی اس کے ذہن میں موجود نہیں تھے۔

’’اب ذرا اپنے رضوی صاحب سے دریافت مطلب کرو کہ میں افتخار بے جا وسرمایہ حیات کے ناٹک کا اسیر ہوں یا نہیں؟‘‘ استاد نے کہا۔

’’کیا مطلب استاد! ذرا آسان کرکے بتائیں۔‘‘

’’مطلب یہ کہ میں اداکاری کرسکتا ہوں یا نہیں؟‘‘

رضوی صاحب نے آگے بڑھ کر استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’میں تو یہ کہتا ہوں کہ آپ صرف اداکاری ہی کرسکتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو کسی اور مقصد کے لیے پیدا ہی نہیں کیا۔‘‘

استاد ہنسے اور ہنستے چلے گئے۔ اس بار تہمینہ بھی ان کی ہنسی میں ساتھ دے رہی تھی۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

پچھلے دنوں استاد کے جاننے والوں میں یہ خبر بہت ہی
وں اور دکھ کے ساتھ پڑھی اور سنی گئی کہ استاد محبوب
لے عالم کا انتقال ہوگیا۔

یہ خبر ایک معروف روزنامہ سمیت ہر اخبار میں شائع
ل تھی۔ جس کی سرخی یہ تھی کہ خاندانِ مغلیہ کے آخری چشم
اغ چل بسے۔

یہ اور بات ہے کہ خاندانِ مغلیہ کی روحیں استاد کو خود
ملسوب کیے جانے پر بوکھلا اٹھی ہوں لیکن استاد تو استاد
۔ وہ خود کو بے دھڑک خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ کہا
تے تھے۔

استاد نامہ پڑھنے والوں کو اب یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ استاد واقعی ایک جیتا جاگتا کردار تھے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے ان کے حوالے سے جتنی کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ سب میرے ذہن کی اختراع ہوں۔

لیکن وہ ایک کردار ضرور تھے۔ (خدا ان کی مغفرت فرمائے)

اب ایسے سیدھے سادے انسان ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ اب تو کمرشل ہونے نے انسان کو پیسے بنانے کی مشین بنا دیا ہے۔ اس کی ساری لطافتیں ختم ہوگئی ہیں۔ اس عہد کے بچے جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کرنے لگے ہیں۔ ان کی

زمانے سے نرالے استاد محبوب نرالے عالم کا ہنستا مسکراتا قصہ

استاد محبوب نرالے عالم سے کون واقف نہیں جو اب تک ناواقف تھے وہ اس واقعے بلکہ 'کارنامے' کو پڑھ کر بخوبی واقف ہوجائیں گے۔ اس بار ان کا واسطہ ایک پہلوان سے پڑا اور وہ اسے شکست سے دوچار کرنے پر تل گئے ہیں۔

مقابلہ

منظر امام

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

معصومیت کہیں گم ہو چکی ہے۔ اب ایسی پُر آشوبی میں استاد جیسے لوگ کہاں سے لائے جائیں۔

میں نے استاد کی شخصیت کو پینٹ کرنے میں کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔

لانبے چوڑے، سیاہ فام، شانوں تک بڑھے ہوئے گیسو، سرخ سرخ بڑی بڑی آنکھیں اور پھر ان کی وہ جناتی زبان۔

وہ زبان ہی سب کچھ تھی۔ جب وہ بولنا شروع کرتے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

میں نے ان کے جو کارنامے بیان کیے ہیں یا ان کی جو زبان لکھی ہے، وہ اپنی طرف سے لکھی ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں۔

استاد تو اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن میں ان کے کارناموں کو گاہے بگاہے یاد دلانے کی کوشش کرتا رہوں گا کہ ایسا کردار بالکل ہی فراموش نہ کر دیا جائے۔

ان کی یہ کہانی ان کے اسی قسم کے ایک انوکھے کارنامے کی ہے۔

استاد نے شہر کے ایک بہت بڑے پہلوان کو کشتی کا چیلنج دے دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر محلے میں اکھاڑے ہوا کرتے اور ہر ایک کو جان بنانے کا شوق ہوتا تھا۔

صبح ہوتے ہی لوگ لنگوٹی باندھے اکھاڑے کی مٹی پر لوٹ پوٹ ہونے لگتے۔ ایک دوسرے کی مالش کی جا رہی ہے۔ کسرت کرائی جا رہی ہے۔ استاد اور شاگرد دونوں ہی موجود ہیں۔ پہلوانوں کی ساکھ بندھی رہتی تھی۔ ایسے ہی پہلوانوں میں ایک بانکا پہلوان بھی تھا۔

وہ واقعی بہت بانکا تھا۔

شاید پورے شہر میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے اڑیل بھینسے کو بھی گرا سکتا ہے اور استاد نے اسی پہلوان کو مقابلے کا چیلنج دے دیا تھا۔

ہر ایک کی زبان پر استاد کے اسی چیلنج کی کہانی تھی۔ میں خود بھی یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اسی لیے صورتِ حال معلوم کرنے دوڑتا ہوا استاد کے پاس پہنچ گیا ''میں نے یہ کیا خبر سنی ہے استاد!'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں میاں!'' استاد مسکرا دیے ''نہ بنو دہشتِ خاک دان وگلاب ہائے رنگارنگ ہے۔''

''کیا مطلب استاد! ذرا تشریح بھی کرتے جائیں۔''

استاد نے تشریح کے طور پر فرمایا ''میاں! سلسلہ ہائے دراز بے امان وقاتل بینا ہے اور ظہورِ خلق ہے پیرہنِ تدبیر کا جو آشنائے بانکا اور شاگرد فردش ہے۔''

استاد شاید اس دن کچھ زیادہ ہی جناتی موڈ میں تھے۔ اس لیے ان کی کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ بہر حال بہت دیر کی مغز ماری کے بعد پتا چلا کہ استاد کو ایک بیوہ سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

''لیکن استاد! آپ کی اس محبت کا اس کشتی سے کیا تعلق؟'' میں نے پوچھا۔

''تعلق خبیر و مزید کچھ یوں ہے کہ اس بیوۂ طناز کی ایک جوان لڑکی ہے'' استاد نے بتایا ''اور وہ بے طفلِ سیرگار آہوئے سیارہ ہونے والی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد رحم کریں میرے حال پر'' میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ لیے ''اتنا تو پتا چل گیا کہ اس بیوہ کی ایک لڑکی ہے لیکن اس لڑکی کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

پھر استاد نے اپنی زبان میں تھوڑی آسانیاں پیدا کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا کہ اس لڑکی کی شادی ہونے والی ہے۔ ''وہ تو ٹھیک ہے استاد! کہ اس لڑکی کی شادی ہونے والی ہے لیکن اس سے اس کشتی کا کیا تعلق؟''

''اس سے تعلق ہمدردیانِ ناسوختہ ہے۔'' استاد نے بتایا ''اس کی شادی مبارک بہ طفیلِ شب و روز کردگار بندرہ ہے اور رطب ولسان کی کاغذی پیراہن کے علاوہ نایافت بھی مفقود ہے۔''

بہر حال کئی مراحل کے بعد سمجھ میں آ سکا تھا کہ اس لڑکی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ وہ انتہائی غریب لوگ ہیں۔ ان کے پاس جہیز نام کی کوئی چیز نہیں ہے اس لیے استاد بانکے پہلوان سے کشتی لڑنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ جس نے بھی اسے ہرایا۔ وہ اپنی طرف سے اسے دس ہزار روپے دے گا۔

یاد رہے کہ اس زمانے میں دس ہزار بہت بڑی رقم ہو کرتی تھی۔ لہٰذا استاد اس لڑکی کی مدد کے لیے اپنی قربانی دے رہے تھے۔ میں اسے قربانی ہی کہہ سکتا ہوں کیونکہ وہ شخص یقیناً استاد کا جھٹکا کر دیتا۔

''استاد! کیوں اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو'' میں نے سمجھانے کی کوشش کی ''وہ تمہیں جان سے مار دے گا۔''

''کیوں طفلانِ بچہ ونونہال شیر مادر ہو رہے ہو؟'' استاد ہنس پڑے تھے ''من آنم کہ من دانم جناب بے فرصا الامان مغلیہ خاندان ہیں۔ تارِ عنکبوت کہ حاصل خورد وکلا کر کے رکھ دوں گا۔''

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

سیاست اور کھیل

یومِ پیدائش ہی سے پاکستان اپنے جڑواں پڑوسی کے ساتھ دائمی رقابت کے رشتے میں منسلک چلا آرہا ہے اور اب تک اپنے حریف سے کئی مقابلے جیت چکا ہے۔ جن میدانوں میں اپنے حریف پر ہمیں برتری ہے، وہ تین ہیں۔

ایک یہ کہ انہوں نے تو پہلے اور اکلوتے وزیرِاعظم ہی کو لال و جواہر سمجھ کر برسوں سینے سے لگائے رکھا اور ہم نے اسی عرصہ میں سات آٹھ وزیرِاعظم پیدا کر ڈالے۔ (یہ پیداواری ریٹ ترقی یافتہ ممالک سے بھی زیادہ ہے) ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ ہمارا ہر شہری اپنے آپ کو وزارتِ عظمیٰ کا اہل سمجھتا ہے اور دوسرے ہر شہری کو نااہل۔

دوسرا یہ کہ ان کے وزیرِاعظم صرف سیاست کی کیاری سے پیدا ہوتے ہیں جبکہ ہمارا پورا چمنستان وزیرِاعظموں اور سربراہوں سے مہکتا رہتا ہے۔ کوئی وزیرِاعظم سول سروس سے آیا ہے اور کوئی سازش سے۔ کوئی سربراہ سیاست کے پچھواڑے سے داخل ہوا ہے اور کوئی عسکری دروازے سے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی......

تیسرا یہ کہ ہمارا مدِمقابل جلد بازی میں صرف ایک آئین بنا پایا اور آج تک اسی ایک کچے پکے آئین پر گزارا کر رہا ہے جبکہ ہم کم از کم تین سالم آئین ہضم کر چکے ہیں۔ یہ صرف ہاضمے کا مسئلہ نہیں، اپنے اپنے ظرف کا بھی ہے۔ اگر ہمارا رقیب بلاوجہ ہم سے سرگراں نہ ہوتا تو ہم اسے تحفتاً یا مشورتاً یہ مصرع لکھ بھیجتے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

صدیق سالک کے مضمون اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اقتباس
انتخاب۔ صبغت اللہ محسن، چوک اعظم

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استاد نے کیا کہا ہوگا یعنی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس پہلوان کی ایسی کی تیسی کر سکتے ہیں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا تھا' یہ میں نہیں جانتا تھا۔

''اب تم اس پہلوان خرگوش کو گوش بہ گوش کر دو'' استاد نے مجھ سے کہا۔

''یعنی میں آپ کی طرف سے جا کر چیلنج دے آؤں؟''

''ہاں۔ اس کو خفقان بے پیر کر آؤ۔''

اب پتا نہیں یہ خفقانِ بے پیر کیا تھا بہرحال میں بھی جھلا کر بانکے پہلوان کے پاس پہنچ ہی گیا۔

وہ واقعی ایک خطرناک قسم کا انسان تھا۔ بالکل کسی جنگلی سانڈ کی طرح۔ میں نے استاد کا چیلنج اسے پہنچا دیا تھا ''کیا اس بندے کی موت آ گئی ہے؟'' اس نے حقارت سے پوچھا۔

''اب یہ تو میں نہیں جانتا۔ بس اس کا پیغام تم تک پہنچا رہا ہوں'' میں نے کہا ''تم تاریخ طے کر لو۔''

''ٹھیک ہے'' اس نے غصے بھری گہری سانس لی ''دیکھ لوں گا اس استاد کو۔''

دو چار ملاقاتوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ استاد نے بانکے پہلوان کو چیلنج کر دیا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک عظیم الشان دنگل ہونے والا ہے۔

میں نے استاد کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''استاد! آپ اس بے چاری کی مدد کے لیے کوئی اور راستہ تلاش کریں۔ یہ لڑائی وغیرہ آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔''

استاد کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی ''تم تمثالِ بے آب مت ہو'' انہوں نے فرمایا ''یہ تو اب دیدِ رونق بہ افروز ہونے والا ہے۔ پھر اندیشۂ ہائے دور و دراز ہو جائے گا۔''

پتا نہیں کیا مقصد تھا اس کا۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ استاد نے اس دنگل کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ بلکہ ایک طرح کی جھلاہٹ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اگر کوئی خود ہی اپنی موت کو دعوت دینے لگے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟

دنگل کی تاریخ بھی طے ہو گئی' اٹھارہ اگست۔

پندرہ اگست کو استاد نے مجھ سے کہا ''اب امروز فردا سے میں اسپ ارسلان ہو رہا ہوں۔ بس تم ایک خرِ بے ماہی و بے آب کا بندوبست کر لو۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس جملے سے استاد کا کیا

مقصد تھا۔ میں نے جب استاد سے اس کی تشریح طلب کی تو وہ بری طرح ناراض ہو گئے ''تم کیا بالکل ہی خادم اوراق پریشاں ہو۔ عندلیب کج ادائی کا پیمانہ ہو' شانہ ہو' کیا ہو۔''

''استاد! میں اپنی نااہلی کا اعتراف کرتا ہوں'' میں نے کہا ''لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کس چیز کا بندوبست کروں۔''

''گدھے کا'' استاد نے فرمایا۔

''گدھے کا؟'' میں نے حیران ہو کر استاد کی طرف دیکھا ''آپ گدھے کا کیا کریں گے؟''

''اس ناہنجار غتربود پہ افتادہ و پیادہ طرابلس کی طرف روانہ ہو جاؤں گا'' استاد جھلا کر بولے ''جب عرض حال مدعا اور فکر تمنا کر ہی دیا ہے تو پھر سوالات گور چشم کیوں کر رہے ہو؟''

مطلب یہ تھا کہ جب استاد نے ایک بات کہہ دی تھی تو میں بار بار سوال کیوں کر رہا تھا ''استاد! یہ گدھا آپ کو کب چاہیے؟''

''بروز دنگل۔ بہ امید فرساد و خامۂ بے طلب کے ساتھ۔''

یعنی ٹھیک دنگل کے وقت استاد کو ایک عدد گدھے کی ضرورت تھی اور استاد نے اس کے ساتھ ہی ایک ڈیوٹی بھی میرے سپرد کر دی تھی۔ وہ ڈیوٹی اس دنگل والے تماشے سے کہیں زیادہ احمقانہ تھی۔

استاد نے یہ کہا تھا کہ جیسے ہی دنگل شروع ہو' میں ایک چھڑی لے کر زور زور سے اس گدھے کو مارنا شروع کر دوں تا کہ وہ رینکنے لگے۔ استاد نے یہ عجیب کام لگایا تھا۔

اس زمانے کے مضافاتی دنگل وغیرہ عام طور پر کھلے میدانوں میں ہوا کرتے تھے۔ لوگ چاروں طرف جمع ہو جاتے اور درمیان میں تماشا شروع ہو جاتا۔ اسی لیے یہ پریشانی نہیں تھی کہ میں گدھے کو کس طرح وہاں لے جاؤں گا۔ پریشانی تو یہ تھی کہ استاد نے ایسا انوکھا کام کیوں بتایا تھا؟

میں نے جب استاد سے دوبارہ اس حرکت کا مقصد دریافت کیا تو وہ سخت ناراض ہو گئے ''تم تو اطریفل کو جاپان صد حساب سے خورد کلاں کرو۔ تمہیں صف آرایان شکن و بت پرستاران تغلق اور بہلول سے کیا واسطہ۔ تم تو بس حمریب زیتون لے کر اس ناہنجار خرداغ داغ پر سمند ناز کرتے جانا۔ یہی تمہارا حیلۂ کرم وجود بے سخاوت ہے۔ اب اس سے مزید اندیشۂ فردا نہ کرو کہ یہ چراغ بے ایمان سلطان

بے نشان کا پروردۂ غلطیدہ اور آرامیدہ ہے۔''

وہ پتا نہیں کیا کیا بولتے رہے لیکن میں وہاں سے کھسک آیا تھا۔

بہرحال یہ طے ہو گیا تھا کہ مجھے دنگل والے دن کسی گدھے کا بندوبست کرنا ہے اور جیسے ہی دنگل شروع ہو۔ اس کو چھڑی سے مارتے رہنا ہے اور یہ سب کس لیے ہو رہا ہے۔ وہ معلوم کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کا احمقانہ کام خود میں تو نہیں کر سکتا تھا۔

اسی لیے میں نے دو لڑکوں کو پیسے دے کر اس کام پر لگا دیا تھا۔ وہ دونوں بہت تیز قسم کے لڑکے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ یہ کام بہت خوبی سے انجام دے لیں گے۔

میں اس بات سے پریشان تھا کہ دنگل کا دن قریب آتا جا رہا تھا لیکن استاد نے کوئی تیاری ہی نہیں کی تھی۔ کچھ تو ہوتا۔ تھوڑی ورزش وغیرہ۔ لیکن استاد کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ان سے زیادہ پریشانی تو خود مجھے ہو رہی تھی۔ ایک دن میں نے پریشان ہو کر استاد سے پوچھ لیا۔ ''استاد! خدا خیر کرے۔ آپ بانکے پہلوان سے لڑنے جا رہے ہیں لیکن آپ نے کوئی تیاری ہی نہیں کی۔''

''یہ تیاری ابتلائے دخان ہے'' استاد نے کہا ''غرقاب ہونا طول شب مدار سے افروز ہو رہا ہے۔''

''خدا کے لیے آسان کر کے فرمائیں' آپ نے کیا تیاری کی ہے۔''

''وہ جو خر بے زبان و گوسفند عام شہتیر بے اماں کا تزکیۂ جریب زیتون ہے۔ وہ انتشار قلبی اور ذہن کے سوا اور کیا ہے'' استاد نے فرمایا۔

ان کی اس بات سے صرف اتنا پتا چلا کہ استاد نے جو گدھے کا آرڈر دیا تھا' وہی ان کی تیاری تھی۔

''لیکن یہ کیسی تیاری ہے استاد! اس گدھے کا اس کشتی سے کیا مقابلہ!''

''یہی تو ماجرائے چشم کشا ہے'' استاد نے کہا ''دنیائے بے لگام و بے ہنگام کو آبگینہ و شکستہ ہو جائے گا کہ دلی عہد مغلیہ نے کیسی اطلاع ناگہانی سے سرمایۂ حیات چت کر دیا ہے۔''

یعنی سب لوگ اس دن یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ استاد نے کتنی خوبی سے اس بانکے پہلوان کو شکست دے دی ہے۔

بہرحال مقابلے کا دن بھی آ ہی گیا۔

میں نے گدھے کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ دونوں لڑکے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

بھی بالکل تیار تھے۔ بس یہ ہونا تھا کہ مقابلہ شروع ہوتا اور وہ دونوں اس گدھے کو مارنا شروع کر دیتے۔ اس وقت میں اکھاڑے کے پاس ہی جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

بہت بڑا مجمع تھا اور لوگ استاد پر ہنس رہے تھے۔ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ استاد طویل قامت اور صحت مند جسم کے تو تھے لیکن بانکے پہلوان جیسے دیو سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ پہاڑ کے سامنے ایک چیونٹی جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

بہر حال مقابلے کا آغاز ہو گیا۔

بانکے پہلوان کسی طوفان کی طرح استاد کی طرف جھپٹا تھا کہ اچانک گدھے کی آواز گونج اٹھی۔ یہ آواز اتنی کرخت اور بد نما تھی کہ مقابلہ رک گیا تھا۔ سب سے بری حالت بانکے پہلوان کی ہو رہی تھی۔ وہ اچھل اچھل کر اس گدھے کو گالیاں دے رہا تھا۔ کچھ عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال ہو گئی تھی۔

ایک اکھاڑہ ہے۔ جس میں ایک طرف استاد لنگوٹی باندھے کھڑے ہیں۔ دوسری طرف بانکا پہلوان ہے۔ ایک گدھا اپنی پوری قوت سے رینک رہا ہے اور بانکا پہلوان کشتی بھول کر اس گدھے کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔

اس مجمعے کو ایک دل چسپ تفریح مل گئی تھی کیونکہ اب استاد نے بھی اپنی تقریر شروع کر دی تھی۔ وہ اپنی جناتی زبان میں بانکا پہلوان کو للکارتے جا رہے تھے ''احقر کو وجۂ نامراد از زیب ملال کیوں کر رہے ہو۔ اگر چشمک غل خشانی ہے تو جاؤ تو اس اسپ گورخر کو کا پرداز سنگ زیبا کر دو۔''

استاد کی تقریر، بانکے کی گالیاں، اس گدھے کی مسلسل آواز اور مجمعے کی تالیاں اور قہقہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں کیا ہونے لگا ہے۔

کچھ دیر کے بعد بانکے پہلوان نے اکھاڑے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ وہ اس گدھے کو مارنے دوڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں نے جن لڑکوں کو اس کام پر مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بانکے پہلوان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی تھی اور اب بانکا پہلوان ان کے پورے خاندان کی شان میں قصیدے پڑھتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

اور اس طرف اکھاڑے کا رنگ یہ تھا کہ استاد پورے اکھاڑے میں گھوم گھوم کر تقریر کیے جا رہے تھے۔

اکھاڑے کے منتظمین بہت دیر تک بانکا پہلوان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ گدھے اور ان لڑکوں کا تعاقب کرتے کرتے نہ جانے کہاں نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی ہی نہیں ہوئی۔

بالآخر منتظمین نے استاد کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ جسے تکنیکی زبان میں واک اوور کہتے ہیں۔ استاد کو واک اوور مل گیا تھا۔ استاد نے نہ جانے کس طرح ان لوگوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ بانکا پہلوان ان سے خوف زدہ ہو کر فرار ہوا ہے۔

انعام کی رقم استاد کو دے دی گئی تھی۔

یعنی استاد لڑے بغیر اور ایک ہاتھ کھائے بغیر یہ مقابلہ نہ جانے کس شیطانی چکر سے جیت گئے تھے۔ انہوں نے انعام کی رقم سے اس عورت کی مدد بھی کر دی تھی، جس کے لیے یہ سارا کھیل رچایا گیا تھا۔

میں نے جب استاد سے دریافت کیا تو وہ ایک شان بے نیازی سے بولے ''میاں غرقاب ذہن و خلجان ہوش ربا بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ آدمی اسی سے وابستہ طربناک ہو جائے تو پھر سارے بھید از بر صفات و منات ہو جاتے ہیں۔''

مقصد یہ تھا کہ آدمی اپنی عقل سے کوئی کام لے تو سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے استاد! لیکن یہ تماشا اپنی سمجھ میں نہیں آیا۔''

''میں دیدۂ دل کو نجان بے اغراض کرتا ہوا بانکے کی نااتفاقات پر غور کرتا ہوا فروغ سیاہ ہو گیا تھا'' استاد نے بتایا۔ ''پھر مجھے انکشاف دیرینہ و نابینا ہوا کہ بانکے پہلوان کا دشمن جاں و تمکین ہوش آواز گدھا ہے۔ تب میں نے یہ ترکیب بے معال و بے کمال نکال لی۔''

استاد کا یہ کہنا تھا کہ انہیں کسی طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گدھے کی آواز بانکے پہلوان کی چڑ ہے اور یہ آواز سن کر اس کی کیفیت جنونی ہو جاتی ہے۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ بس استاد نے اس کی اسی کمزوری سے شاندار انداز میں فائدہ اٹھا لیا تھا۔

یہ تھی استاد کے ایک معرکے کی داستان۔ اسی طرح کے نہ جانے اور کتنے معرکے استاد نے سر کیے ہیں، میں جن کی کہانیاں لکھ چکا ہوں اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی کہانیاں باقی ہیں۔ اگر آپ کو یہ سلسلہ پسند آیا ہو تو ضرور لکھیں تا کہ میں بھی گاہے بہ گاہے استاد کو یاد کرتا رہوں۔

اب پیدا کہاں.... ایسے پراگندہ طبع لوگ۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استاد اچانک دوڑتے ہوئے مجھ سے آ کر چمٹ گئے۔
اس وقت وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ ان کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ ان کے آبنوسی چہرے سے پسینے کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں۔

''خیر بہت تو ہے استاد!'' میں بھی ان کی اس حالت کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا ''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''مجھ پر بہ گشتی سگ نالائق آوارہ گان سیارہ بر شکار بقلم ہو رہا ہے'' استاد نے بتایا۔

''خدا کے لیے استاد! صاف صاف بتائیں کیا ماجرا ہے؟'' میں نے بڑی مشکلوں سے انہیں خود سے الگ کیا تھا۔

''امتزاج لعاب ودہن سایہ سے متعاقب بطور ہرن ہے'' استاد نے بتایا۔

''کون ہے' کیا ہے؟ اس وقت صاف صاف بتائیں؟''

بہر حال استاد نے میری جہالت پر دانت پیستے ہوئے صاف صاف الفاظ میں بیان کیا کہ وہ مجھ سے ملنے آ رہے تھے کہ ایک خونخوار قسم کا کتا ان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ انہیں پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔

ویسے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بے چارے استاد کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ وہ جس طرف سے بھی گزرتے ہیں'

کہتے ہیں کہ جب سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو اسے ٹیڑھا کرنا ہی پڑتا ہے۔ استاد نے بھی ایک عوامی شکایت کے ازالے کے لئے انوکھے طریقے سے انگلی کو ٹیڑھا کیا تھا۔ لیکن نصیب دشمناں کہ نتیجتاً نہ گھی نکلا اور نہ ہی پھر کبھی انگلی سیدھی ہوسکی۔

آوارہ کتوں اور بدعنوان ڈاکٹروں کے خلاف دلچسپ احتجاج کا احوال

غوغائے سگاں

منظر امام

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

آوارہ کتے انہیں دیکھ کر بھونکنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ استاد کا حلیہ تھا۔ کتے بھی انہیں آسمانی مخلوق سمجھا کرتے تھے لیکن استاد کا فلسفہ بالکل مختلف تھا۔ وہ یہ فرمایا کرتے ''یہ کتے امتحان درپیش بے سرائے درویش ہیں۔''

یعنی یہ کتے انہیں دیکھ کر اس لیے بھونکتے ہیں کہ درویشوں کی شان ہی یہی ہے۔ خدا جانے استاد نے ایسے کن درویشوں کے بارے میں سن رکھا تھا' جن پر کتے بھونکا کرتے ہوں۔

استاد ویسے ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ان دنوں کتے بھی بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ ہر طرف ان کے غول کے غول دکھائی دیتے۔ ان کتوں نے راہگیروں کا چلنا دوبھر کر دیا تھا لیکن حکومت کی طرف سے انہیں ٹھکانے لگانے کا کوئی انتظام ہی نہیں ہوتا تھا۔

''اب میرے ساتھ بہ نفسِ نفیس کاشانہ مرحمت کرو'' استاد نے مجھ سے کہا۔

استاد کا مطلب یہ تھا کہ میں اب انہیں ان کے گھر تک پہنچا آؤں کیونکہ استاد کتوں کی وجہ سے بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔

راستے بھر استاد کتوں کو برا بھلا کہتے رہے تھے۔ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا ''استاد! آپ تو کہتے تھے کہ کتے درویشوں کا امتحان ہیں' انہیں ضرور ہونا چاہیے۔ پھر آج آپ انہیں بددعائیں کیوں دے رہے ہیں؟''

میری اس بات پر استاد بھڑک اٹھے تھے ''تم کو وجہ مفاصل نہیں معلوم۔ وہ سگان بت فروش وآ ہوئے چشماک اس زمانے کے سفیدہ ودیدہ تھے۔ جبکہ آج کے سگان کم حرف وملامت آگیں ویسے شب باشی وفراضی نہیں رہے۔''

مطلب یہ کہ اس زمانے کے کتے بہت سمجھدار اور خود بھی دردمند دل رکھنے والے ہوا کرتے تھے جبکہ آج کل کے کتے صرف کتے ہوتے ہیں۔ ان میں سوائے بھونکنے اور کاٹنے کے اور کوئی خوبی نہیں ہوتی۔

بہرحال میں استاد کو ان کے محل تک پہنچا کر واپس آ گیا۔

دو چار دنوں بعد استاد نے کسی آدمی کے ذریعے مجھے بلوالیا۔ اس آدمی کا یہ کہنا تھا کہ استاد کئی دنوں سے اپنے محل ہی میں مقیم ہیں۔ انہوں نے باہر نکلنے سے توبہ کر لی ہے۔

میں جب استاد کے پاس پہنچا تو وہ بہت پُرجوش نظر آ رہے تھے

''زحمت آگیں'' انہوں نے ایک مونڈھے کی طرف اشارہ کیا جو کسی زمانے میں شاید مونڈھا رہا ہوگا لیکن اب نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

''بزرگان سلفان وبکاران نے خواب چشم بریدہ کو سرفراز وزبوں کر کے نسخۂ سگاں زنجیر کر دیا ہے'' استاد نے بہت خوش ہو کر یہ خوشخبری سنائی تھی۔

اور اس خوش خبری کا آسان ترجمہ یہ ہے کہ خواب میں کسی بزرگ نے آ کر استاد کو کتوں سے بچنے کا کوئی وظیفہ بتا دیا تھا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے استاد! کیا ہے وہ وظیفہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سن لو اور بہ ہنگام دماغ فرسودہ کرلو'' استاد نے کہا یعنی سنو اور ذہن میں محفوظ کر لو۔

پھر استاد نے وہ وظیفہ بتایا جو شاید کچھ اس طرح تھا ''اے اوسگان باتمکین وتمکین وخفکین۔ باہوش درجۂ مخلوق من باہوش رذال بہ طریق مہر بدمعاملگی کیوں دشنام طرازی خوان بے جا ہو رہا ہے۔''

''استاد' یہ ہے وہ وظیفہ؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''زیبائے نور ودستور ہے'' استاد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''لیکن استاد! یہ تو ایسا وظیفہ ہے کہ جس کو پڑھنے کے دوران میں کتا دس دفعہ کاٹ چکا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر استاد کا چہرہ اتر گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے خواب میں وظیفہ سنتے وقت اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا اور اب وہی بزرگ اگر دوبارہ خواب میں نظر آئے تو ان سے کوئی مختصر وظیفہ پوچھ لیں گے۔

کئی دنوں تک پھر استاد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے وہ بزرگ انہیں خواب میں دکھائی دیے یا نہیں۔ استاد نے پھر ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

استاد کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو بزرگ ذرا مشکل ہی سے مانتے تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے تقریباً چار سو ساٹھ برس تک ریاضت کی ہے۔ ساٹھ برس اس دنیا میں اور چار سو برس عالمِ ارواح میں۔

ان کے ایک بیان کے مطابق وہ پیدا ہونے سے پہلے عالم ارواح میں بھی شاعری کیا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی وہ مشہور و معروف غزل، لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں' بہادر شاہ ظفر نے وہیں سے چرائی تھی یعنی عالم ارواح سے۔

بہرحال ایک دن پھر استاد نے یاد فرمایا' بلانے والے کا عجیب بیان تھا ''منظر صاحب! استاد نے تو اپنی چارپائی سے ایک آدمی کو باندھ رکھا ہے۔''

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

"آدمی کو باندھ رکھا ہے؟" میں حیران ہوگیا تھا "وہ کیوں؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔ آپ خود چل کر دیکھ لیں۔"

بہر حال میں یہ خبر سن کر دوڑتا ہوا استاد کے محل پہنچ گیا۔ استاد نے واقعی ایک بندے کو چارپائی سے باندھ رکھا تھا اور وہ شخص پورے جوش و خروش سے استاد کو گالیاں دیے جا رہا تھا۔

"استاد! یہ کیا تماشا ہے؟"

"یہ غتر بود بہ رشتۂ استوار ذبیحہ ہے" استاد نے بتایا۔

"خدا کے لیے استاد! ذرا آسان بیان کریں' کیونکہ معاملہ سیریس معلوم ہوتا ہے۔"

استاد اپنے بیان کو کس طرح آسان کر سکتے تھے' مجھ ہی کو سمجھنے میں محنت کرنی پڑی تھی۔ بہت دیر کے بعد پتا چلا کہ وہ آدمی ان کا کوئی دور کا رشتے دار تھا اور بدقسمتی سے وہ استاد سے ملنے آ رہا تھا کہ راستے میں اسے کسی کتے نے کاٹ لیا۔ وہ بے چارہ جب بھاگ کر استاد کے پاس پہنچا تو استاد نے اسے پکڑ کر چارپائی سے باندھ دیا تھا۔

"یہ کیا حماقت ہے استاد!" میں نے حیران ہو کر پوچھا "چھوڑیں اس بے چارے کو۔ اسے کتے نے کاٹ رکھا ہے اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔"

"اسی باعث تو دار شفا کو مجمع بے انبوہ و کوہِ گراں کا بندوبستِ اولیٰ کیا ہے میں نے" استاد نے کہا۔

میں ان کی بات سن کر اور حیران ہو رہا تھا "یہ کیا بات ہوئی استاد! آپ اسے ایک مجمع کی صورت میں اسپتال لے جائیں گے؟"

"ہاں یہی تو رمز شہر میں نخاں ہے" استاد نے کہا۔

اتنی دیر میں استاد کے محل کے باہر نہ جانے کہاں سے چالیس پچاس آدمی آ کر جمع ہوگئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ سب استاد کے اشارے پر جمع ہوئے تھے اور استاد اس ہجوم کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوئے جا رہے تھے۔

"بدنصیبان عصمت فروشو" استاد اب مجمع پر برس پڑے تھے "مریض دم بلب و جاں سوختن کو فروش ہائے شانۂ دبے ایام کرو۔ مردک بے چھپر مہمان سرائے جاودانی ہے۔"

اب وہ لوگ استاد کی یہ زبان کہاں سے سمجھتے۔ اس لیے سب کے سب خاموش کھڑے رہے۔ ان کی بے حسی اور خاموشی دیکھ کر استاد کا پارہ گرم ہوا جا رہا تھا "او کابوسو۔ بے خامو! لب ہائے دندان سرمایہ کیوں لیے کھڑے ہو۔ اس مردک بے آفریں کو شفائے کلی عنایت کرو۔ اٹھاؤ اس بستر بے ہنگام و چرغ تغو کو اور عازم سفر ہاسپٹل کرو۔"

اب میری سمجھ میں بھی آ گیا تھا کہ استاد یہ کہہ رہے تھے کہ اس آدمی کی چارپائی اٹھاؤ اور جس طرح کسی جنازے کو لے جاتے ہیں' اسی طرح اس کو اٹھا کر اسپتال لے چلو۔

یہ عجیب تماشا تھا۔ محلے والوں کو ایک تفریح ہاتھ آگئی تھی۔

وہ بے چارہ چارپائی سے بندھا ہوا چیختا چلاتا رہا لیکن لوگوں نے اس کی چارپائی کو کاندھوں پر اٹھا لیا تھا۔ پھر بڑی شان سے یہ قافلہ اسپتال کی طرف روانہ ہوا۔

آگے آگے خود استاد جھومتے جھامتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے چارپائی پر ایک زندہ آدمی کا جنازہ تھا۔ جو استاد کو جی بھر کے گالیاں دیتا جا رہا تھا۔ اس نے ساری رشتے داری تہ کر کے ایک طرف رکھ دی تھی۔ اس چارپائی کے پیچھے محلے کے چالیس پچاس آدمی تھے اور ہاں' کاندھے بھی بدلے جا رہے تھے۔

ایسا عجیب و غریب جلوس شاید کسی اسپتال میں پہنچا ہوگا۔ اسپتال والوں نے جب یہ تماشا دیکھا تو وہ خود پریشان ہوگئے تھے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔

ضرورت برائے ڈسٹری بیوٹرز
کتابیات پبلی کیشنز کراچی
اور
مکتبہ نفسیات
کی کتب کی ڈسٹری بیوشن کیلئے ملک بھر میں ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔ خواہش مند افراد ذیل میں دیئے گئے پتے پر رابطہ کریں۔
خط لکھ کر کتابوں کے پوسٹرز مفت طلب کریں
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5804300 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

''یہ درفتنۂ سگان کوچہ بے آرام ہے'' استاد نے بتایا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ آدمی؟'' ڈاکٹر بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے آگے بڑھ کر معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی ''یہ جو بندہ چارپائی پر لیٹا ہوا ہے' اسے کتے نے کاٹ لیا ہے۔''

''تو اسے جنازے کی طرح لانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ تو آپ استاد سے پوچھیں'' میں نے استاد کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ آدمی تو مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔''

''خیر اسے چھوڑیں' اس کا تو علاج کریں۔''

''سوری۔ فی الحال اسپتال میں ویکسین موجود نہیں ہے۔''

''بس' بس'' استاد اچانک چیخ اٹھے ''یہی تو نکتہ آفریدہ دمالہ ہے۔ مجمع بے رنگ و امید ہوس فرمودہ غلطیدہ یوں ہی محوکش چارپائی وہ جنازہ بے ثبات نہیں ہوا ہے۔ یہی الفاظ پے چیدہ و بیم بریدہ سرمایۂ بے ہنگام بے ثبات تھا۔ وگرنہ خاک بسر انسان کو شرفِ آدمیت سے فیض مبرا کیوں ہو۔ گرمی بے بسی پہ کل بجلی۔''

''یہ کیا بکواس کیے جا رہا ہے؟'' ڈاکٹر نے غصے سے پوچھا۔

میں نے استاد کی اس عجیب و غریب تقریر سے جو مطلب اخذ کیا تھا وہ کچھ یوں تھا کہ استاد اسپتال والوں کی اس عادت سے اچھی طرح واقف تھے کہ وہ ویکسین دینے سے انکار کر دیں گے کیونکہ یہی ویکسین انتہائی مہنگے داموں بازار میں فروخت کے لیے بھیجی جاتی ہے۔ استاد اس لیے اپنے ساتھ پورے مجمع کو لے کر آئے تھے کہ سب کے سب اس بات کے گواہ رہیں۔

استاد کی اس حرکت نے اسپتال میں ہلچل مچا دی تھی۔ پورا محلہ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ زخمی شخص چارپائی پر بندھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے اردگرد پورے محلے والے جمع تھے اور استاد اچھل اچھل کر بولے چلے جا رہے تھے ''بے داد گر' نابکار' کوفہ و بغداد کے پرورش کنندہ یہ مریض سگاں در خوئے ابتلائے اموات ہے۔ واقف حال کر دو اس سیر چشمک بے مہریاں کو یا اس کا علاج خوں بہا کرو۔ ورنہ ہم بلائے جنبش پہاڑ بے اٹل ہیں یعنی اس کا علاج کرو ورنہ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔''

اسپتال والوں کو اپنی ساکھ ڈوبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ آس پاس کے لوگوں کو بھی جب یہ صورتِ حال معلوم ہوئی تو وہ بھی استاد اور مجمع کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ ان سبھوں کو یہ شکایت تھی کہ محلے میں کتے بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور کوئی ان کی روک تھام کرنے والا نہیں ہے اور جب کسی شخص کو کتا کاٹ لیتا ہے تو اسپتال والے ویکسین نہ ہونے کا بہانہ کر دیتے ہیں۔

یہ ایک عوامی شکایت تھی اسی لیے استاد اپنی اس انوکھی ترکیب کی وجہ سے سب کی نگاہوں میں آ گئے تھے۔ ہر شخص ان کی جناتی زبان کے باوجود ان کی تعریف کیے جا رہا تھا۔ بلکہ ایک آدمی تو یہ بھی کہہ رہا تھا ''یہ کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے فرشتوں کی زبان بول رہا ہے۔''

استاد نے اسپتال والوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

بہرحال انہوں نے کسی نہ کسی طرح ویکسین کا بندوبست کر دیا تھا اور استاد کے اس رشتے دار کو ٹیکے لگا دیے گئے لیکن استاد کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس لیے انہوں نے اسپتال کے انچارج سے کہا ''دیکھو۔ اے پیر عز توت و شہتوت۔ میں اس طرح منجلۂ ہائے مریضانِ سگاں کو بہ کو کے در جلوس در بغل مارا ایم کہ مرحاندی یہاں حاضر خدمت و توقیر کرتا رہوں گا۔ تم شفائے آب کلی تیار و محفوظ رکھنا وگرنہ شب ویدہ ایم کہ بہ مزاراں ماغریاں۔''

استاد کی اس جناتی زبان کے باوجود اس ڈاکٹر نے حیرت انگیز طور پر استاد کی یہ دھمکی سمجھ لی تھی کہ وہ شہر بھر سے کتوں کے کاٹے ہوئے مریضوں کو اسی طرح جلوس کی صورت میں اسپتال لاتے رہیں گے اور ان کے لیے دوائیں تیار رہنی چاہئیں۔

استاد نے یہ بڑا کارنامہ تو انجام دے دیا تھا لیکن اس کارنامے کے چکر میں انہوں نے اپنے رشتے دار بے چارے کا بیڑہ غرق کروا دیا تھا۔

انہوں نے اس کو اسپتال لانے میں اتنی دیر کر دی تھی کہ سنا ہے کہ اس پر دواؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ پاگل ہو کر مر گیا لیکن استاد اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اسپتال والوں نے بے چارے کو یوں ہی کوئی اور انجکشن لگا دیا تھا کیونکہ انہیں اپنی جان چھڑانی تھی۔

ہو سکتا ہے کہ استاد کی یہ بات درست بھی ہو۔ ویسے آج کل بھی ہر طرف کتوں کے غول منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ استاد کا وہ وظیفہ یاد ہی کر لوں۔ جو کسی بزرگ نے انہیں خواب میں بتایا تھا۔ یعنی اے بے ادو سگاں با تمکین و تمکین و خفگین۔ باہوش درجۂ مخلوق من اشرف رذال بہ طریق مہر بد معاملگی......''

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

آئو یورپ چلیں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

منظر امام

یوں تو استاد آسانی سے کسی کے جھانسے میں آنے والے نہیں تھے، مگر شاید ملک سے نکلنے اور یورپ دیکھنے کے شوق نے انہیں اس مشکل میں پھنسا دیا تھا، وہ تو خیر ہوئی ورنہ نہ آج ہم ہوتے نہ استاد کی کہانیاں۔ مگر افسوس ہوتا ہے ایسے لوگوں پر جو چند ٹکوں کی خاطر انسانی جانوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔ کبھی کبھی جعلی پیروں کے کردار کیا کیا کرشمہ سازیاں دکھا جاتے ہیں۔

دعا کی قبولیت کے لئے نہ جگہ کی قید ہے، نہ وقت کی

''ابے نامعقول' ناہنجار' طفلِ مکتب' انا بحر او قیانوس۔ چشمک خورد و کلاں۔ بے ہوش دگوش۔ یہ بحرِ مردار ید میں کس قماش کا ابنائے افشار کر رہا ہے۔''

یہ آواز استاد کی تھی اور وہ اپنی پوری شان اور تمکنت کے ساتھ گرجے جا رہے تھے۔ جبکہ آس پاس کے لوگوں نے شاید اپنے سر پیٹنے شروع کر دیے ہوں گے۔

''اوئے اس کی زبان بند کراوئی'' ایک شخص نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا ''اگر یہ چپ نہیں ہوا تو ہم اس کو پانی میں دھکا دے دے گانی؟''

میں نے استاد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے ''خدا کے لیے استاد' اس وقت چپ ہو جاؤ'' میں نے کہا ''یہ بہت نازک موقع ہے۔''

''یہ موقع نہیں اطریفل بے گمانی ہے'' استاد غصے سے بولے۔ ''میں ان نابغوں کو استوار بے جا کر دوں گا۔''

''بس استاد خاموش ہو جاؤ'' مجھے بھی غصہ آنے لگا تھا ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

استاد شاید میری ناراضگی محسوس کر کے خاموش ہو گئے تھے۔

اس کہانی کی ابتدا ایک مہینہ پہلے سے ہوئی تھی۔ استاد سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ورنہ عام طور پر وہ ہر دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آ جاتے تھے اور اگر خود نہیں آ پاتے تو کسی کو ضرور بھیج دیتے۔ بہر حال جب کئی دنوں سے ان کی خبر نہیں آئی تو میں خود استاد کے پاس پہنچ گیا۔

استاد اس وقت ایک عجیب عالم میں تھے۔ ان کے سامنے چمڑے کے کئی جیکٹس پڑے ہوئے تھے اور وہ ہر ایک کا معائنہ کرتے جا رہے تھے۔ ''کیا ہو رہا ہے استاد؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ دیکھو' یہ جریب زیوتن کیسی ہے؟'' استاد نے ایک جیکٹ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھی ہے لیکن یہ آپ کے کس کام کی۔ اس قسم کی چیزیں تو بہت ہی سرد ملکوں میں استعمال ہوتی ہیں۔''

''تو میاں برلن بھی تو برج النہار کے مقابلے برف زارِ افشاں ہے'' استاد نے کہا۔

ان کے اس جملے میں صرف برلن سمجھ میں آیا تھا۔ اس لیے میں نے دریافت کیا ''استاد! یہ برلن سے آپ کا کیا تعلق۔ وہ تو جرمنی کا شہر ہے۔ (برلن اس زمانے میں مشرقی جرمنی کا شہر تھا اور کمیونسٹ بلاک کے تحت آتا تھا)

''امتداد بالخوف ہو گیا ہے مجھے'' استاد نے بتایا ''میں سفر ترک ارض وسما کر رہا ہوں۔ جس کے لیے بندوبستِ دیوار چین ہو گیا ہے۔ دجال بے ہنراں نے وعدہ فردا فرما دیا ہے کہ ما حضر قبول لیا جائے تو شرف بالذات و بے کیش ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ سکہ رائج الوقت پیش افتادہ کر دیا جائے۔''

استاد نے میرے سوال کے جواب میں ایک عدد تقریر فرما دی تھی جس کا مطلب خود ہی سمجھ سکے ہوں گے۔ میرے تو سر سے گزر گئی تھی۔

''خدا کے لیے' استاد ذرا آسان کر کے فرمائیں کہ اب آپ کو کون سا جنون ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

استاد نے پھر ایک تقریر کی اور یہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ برلن جانا چاہتے ہیں اور کوئی ایجنٹ مل گیا ہے جو انہیں برلن پہنچانے کو تیار ہے اور اس کے عوض اس نے استاد سے پانچ ہزار روپے طلب کیے ہیں۔ (اس زمانے میں پانچ ہزار بھی بہت ہوتے تھے)

''میاں' تم بھی بقلم خود ہو جاؤ'' استاد نے کہا ''تمہاری وجہ سے وارفتگی اور شیفتگی رہے گی۔''

''نہیں استاد! میرا جانا ذرا مشکل ہے۔''

''مشکل بعذر آفند۔'' استاد نے پتا نہیں فارسی میں کیا کہنے کی کوشش کی تھی ''جہاں تک اخراجات تائید اور عائد کا بحران ہے' میں شاہان بے زمان ہوں تمہارے لیے۔''

یعنی جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے۔ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔

وہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ یعنی اتنی گھریلو پریشانیاں نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے بھی تفریح کی خاطر ہاں کر دی۔

''بہتر ہے استاد! میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ کا کیا ہوگا۔''

''جہاں تک پروانۂ پاسپورٹ کا سوال اندمال ہے' وہاں تک وہ ایجنٹ ذمے داران بلاکستان ہے'' استاد نے بتایا ''حصول ویزا وسیلۂ ظفر بے ظفر بھی اسی کے سپرد ہے۔''

استاد یہ کہہ رہے تھے کہ یہ سارے معاملات وہی ایجنٹ حل کر دے گا۔ اس کو صرف پانچ ہزار روپے دے دیے جائیں پھر استاد نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ابھی پیسوں کے حصول میں لگ گئے ہیں اور ایک ہفتے بعد ہماری روانگی ہوگی۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں سارے مراحل طے ہو جائیں گے۔

میں بھی اس سفر کے خیال سے پُر جوش ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ایک بات ذہن میں آئی تو میں نے استاد سے پھر پوچھا۔ ''استاد۔ آخر یہ برلن جانے کی کیا تک ہے' ہم کہیں اور بھی تو جا سکتے ہیں؟''

''معاملاتِ درون وجہ سلاسل ہیں'' استاد نے کہا ''اس ایجنٹ کا خالہ زاد یا چچا زاد مقیم فردشان برلن ہے۔''

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے یعنی استاد یہ بتا رہے تھے کہ اس ایجنٹ کا کوئی رشتے دار برلن میں ہے اسی لیے ہمیں بھی برلن جانا ہوگا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیا تھا کہ میں استاد کے ساتھ برلن جا رہا ہوں۔

سب لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کس کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ وہ اول جلول سا آدمی مجھے کسی مصیبت میں پھنسا دے گا۔ لیکن مجھے تو استاد پر پورا بھروسا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ ہو' استاد اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ پھر یہ کہ میں اکیلا استاد کو کس طرح جانے دیتا۔ ان سے تعلق ہی ایسا تھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ایک ہفتے کے دوران میں استاد اپنی جغرافیائی معلومات کے دریا بہاتے رہے تھے۔ برلن کیسا ہے؟ کیا ہے؟ جرمنی کیسا ملک ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کی زیادہ تر معلومات ناقص تھیں' اس حد تک کہ وہ ایفل ٹاور کو برلن میں بتاتے رہے تھے اور میں نے جب صحیح بتانا چاہا تو مجھ سے ناراض ہوگئے۔

ایک ہفتے کے بعد انہوں نے مجھے بلا بھیجا کہ ایجنٹ آنے والا ہے۔ میں ان کے محل آکر اس سے ملاقات کرلوں۔ (استاد اپنی جھونپڑی کو محل کہا کرتے تھے)

بہرحال میں مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ایجنٹ ایک موٹا تازہ انسان تھا' جس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ نہ جانے استاد نے ایسے آدمی پر کیوں بھروسا کرلیا تھا۔ اس ایجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کے پیسے تو استاد نے دے دیے ہیں۔ اب پاسپورٹ کے لیے آپ کی تصویریں چاہئیں اور شناختی کارڈ کی کاپی۔''

''ٹھیک ہے' یہ دونوں چیزیں کل مل جائیں گی۔''

گھر والوں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے تو استاد کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے کسی کی بات نہیں مانی اور اپنی تصویریں اور کارڈ کی کاپی ایجنٹ کے حوالے کردیں۔ اس موقع پر ایجنٹ نے مجھ سے کہا ''بھائی' یہ تمہارے استاد کیا چیز ہیں؟ ان کی کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ یہ کون سی زبان بولتے ہیں؟''

''بولتے تو اردو ہی ہیں'' میں نے بتایا ''لیکن ان کی اردو ذرا دوسری قسم کی ہے۔ بہرحال میں ان کے ساتھ ہوں اس لیے پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں ان کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا ہوں۔'' ایجنٹ مطمئن ہوکر چلا گیا۔

دو دن بعد ہی میرا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ صرف پاسپورٹ ہی نہیں بلکہ اس پر ایسٹ جرمنی کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ ایجنٹ نے بتایا کہ ہمارے ساتھ دس اور بھی جارہے ہیں اور سب کو سولہ تاریخ رات دس بجے استاد کے گھر پر جمع ہونا ہے کیونکہ وہیں سے قافلہ روانہ ہوگا۔ میری خوشی اور جوش کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

بہرحال سولہ تاریخ کی شب میں اپنا ایک سوٹ کیس لے کر پہنچ گیا۔ جہاں دس آدمی پہلے سے جمع تھے۔ استاد نے اس رات بڑی کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار' قمیص اور شیروانی زیب تن کررکھی تھی۔ ان کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔

استاد نے اپنی طرف سے سبھوں کے لیے چائے کا بندوبست کررکھا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد استاد نے مجھ سے کہا۔ ''میاں' ابھی ان دور فتادہ لوگوں کے سامنے مجھے عرضِ حال بہ عارض شمال کرنی ہے۔ تم بس فروخ آسان اردو ہوجاؤ۔''

میں سمجھ گیا کہ استاد ان لوگوں کے سامنے تقریر فرمانے کے موڈ میں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں تقریر کو آسان کرکے لوگوں کو بتاتا رہوں۔ یہ بہت بڑی ذمے داری انہوں نے میرے سپرد کردی تھی۔ بہرحال میں نے ہامی بھرلی بس پھر کیا تھا' استاد شروع ہوگئے تھے۔

''اے خانہ خرابو' دور چشمو' ارذلو۔ تم آج سفیر بگوش حلقۂ برلن سے سونف اور زعفران ہونے جارہے ہو۔ یہ مقام قہقہہ بردوش وجد آفرین ہے۔''

میں نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا میرے عزیز بھائیو! یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آج تم سب برلن کے سفر پر جارہے ہو۔''

استاد نے پھر کہا ''میں یعنی من آنم کہ من دانم گوشۂ فراق سے رہبر بے اول.... دبے بود ہوں۔ تم سب کے سب بجا آوریٔ احکاماتِ مغل اعظم اور انارکلی کرتے رہوگے۔''

یعنی اس سفر میں تمہارا لیڈر میں ہوں۔ اس لیے تم لوگوں کو میرے احکامات کی تعمیل کرنی ہوگی۔

استاد نے اس کے بعد بھی اپنی تقریر جاری رکھی اور وہی باتیں تھیں جو ان کی شان کے عین مطابق تھیں یعنی جن کا کوئی مطلب نہیں نکلتا تھا۔ ہمارے ساتھ سفر پر جانے والے استاد کی قابلیت سے اتنے مرعوب ہوچکے تھے کہ کسی میں بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ استاد نے سب کو یہ بھی بتادیا تھا کہ برلن پہنچتے ہی سب کو ایفل ٹاور پر حاضری دینی ہے۔

اس سفر پر جانے والے چونکہ سب کی معلومات استاد ہی جیسی تھیں' اس لیے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔

رات گیارہ بجے وہ ایجنٹ ایک پرانی وین لے کر آگیا۔

''چلو'' اس نے وین کی طرف اشارہ کیا ''جلدی جلدی اس میں بیٹھ جاؤ۔''

ہم سب جلدی جلدی اس وین میں بیٹھ گئے تھے۔ یعنی اب ہمارا اصل سفر شروع ہونے جارہا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین روانہ ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ ہم ائرپورٹ کی طرف جارہے تھے لیکن جب بجائے ائرپورٹ کے ہم ساحل کی طرف جانے لگے تو میں نے استاد سے سرگوشی کی۔ ''استاد! یہ ہمیں کہاں لے جارہا ہے۔ ائرپورٹ تو دوسری طرف ہے۔''

''عازم برلن والا بادِ پیما کہیں اور براجمانِ اقدس ہوتا ہے'' استاد نے بڑے وثوق سے فرمایا تھا۔ یعنی برلن جانے والا طیارہ کہیں اور کھڑا ہوا کرتا ہے۔

بہرحال میں بھی خاموش رہا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ہمیں اتار دیا گیا۔ یہ ساحل ہی تھا۔ اس زمانے میں ساحل اتنا بارونق نہیں تھا۔ جتنا آج ہے۔ سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر جو اندھیرے کی وجہ سے بہت بھیانک دکھائی دے رہا تھا ''یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟'' میں نے اسی ایجنٹ سے پوچھا۔

''ساحل پر'' اس نے اطمینان سے بتایا پھر اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا ''وہ دیکھو ادھر کشتی کھڑی ہے۔ تم لوگوں کو اسی میں جانا ہوگا۔''

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ برلن یورپ میں ہے اور صرف کشتی کے ذریعے وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا اس لیے میں نے کہا ''کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ کیا ہم اسی کشتی کے ذریعے یورپ جائیں گے؟''

''ڈائریکٹ یورپ نہیں جانا ہے'' ایجنٹ نے کہا ''پہلے تم لوگ شارجہ جاؤ گے' وہاں سے تم کو لے جایا جائے گا۔''

پتا نہیں یہ کیسا سفر تھا لیکن اب تو آ کر پھنس چکے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ استاد کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ حالانکہ اصولاً ان ہی کو سب سے زیادہ شور کرنا تھا لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم لوگوں کو کشتی میں بھر دیا گیا۔ اسی کشتی میں دو آدمی اور بھی تھے جنہیں آپ کشتی کے ناخدا کہہ سکتے ہیں۔ وہ دونوں بہت قوی ہیکل قسم کے مکرانی بھائی تھے۔

کھلا آسمان' اندھیرے میں ڈوبا ہوا سمندر اور کشتی کا سفر۔

استاد نے بہت برا پھنسایا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

اس کشتی کے ایک ناخدا نے ہم مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دیکھو ڑے' تم لوگوں کو زبان بند رکھنے کا ہے۔ سفر میں شور مور نہیں مچانے کا ہے اور جس نے بھی رولا مچایا ہم اس کو سمندر میں پھینک دے گا۔''

استاد نے ایسی صاف صاف زبان پہلے کہاں سنی ہوگی۔ اسی لیے وہ ایک دم سے بھڑک اٹھے۔ ایک لمحے میں ان کی مسلسل خاموشی اچانک ہی ختم ہوگئی تھی۔ انہوں نے زور زور سے گرجنا شروع کر دیا ''ناخداؤ' آذربائی جانو! مربیانہ بے شفقت اور بے دارادرستم۔ تم سب بزرمہر ہوا آلام روزگار کے سیل بلا ہو' دروکش ہو۔ تم فقیرانہ بے مروتی خاک بستر ہو کم بختو! تمہیں نابغۂ روزگار کی قدر افزوں نہیں ہے۔''

''اوئے' یہ کیا بول رہا ہے؟'' ناخدا نے پریشان ہو کر مجھ سے پوچھا۔

''پیر صاحب کو جلال آ گیا ہے'' میں نے جواب دیا ''یہ بہت جلالی بابا ہیں۔''

اس وقت نہ جانے کیسے سے میرے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایسے لوگ بہت کمزور عقیدے کے ہوتے ہیں اور پیروں فقیروں سے بہت مرعوب ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ نسخہ کام آ گیا تھا۔ ایک تو استاد کا عالی شان حلیہ' پھر ان کی اس جناتی گفتگو نے ان ناخداؤں کے ہوش اڑا دیے۔ وہ دونوں آپس میں کچھ بولنے لگے تھے۔ کبھی کبھی خوف زدہ نگاہوں سے استاد کی طرف بھی دیکھ لیا کرتے۔

میں نے استاد سے کہا ''استاد۔ ہم سب برے پھنس گئے ہیں۔ یہ لوگ فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں کہیں پھنسا کر خود بھاگ لیں گے اور ہم زندگی بھر جیل میں بند رہیں گے۔''

استاد اپنی تمام تر عظیم الشان حرکتوں کے باوجود پولیس وغیرہ سے بہت گھبرایا کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی ان کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ ''تو اب کیا سخن دلپذیری ہو؟'' انہوں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ تو آپ جانیں'' میں نے کہا ''یہ لوگ ہمیں کسی جزیرے پر اتار کر بھاگ لیں گے' ہمیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔''

استاد اس وقت واقعی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ پریشانی تو مجھے بھی ہو رہی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کے تاثرات بھی یہی بتا رہے تھے کہ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک نے بابا کو مخاطب کیا ''بابا۔ تم بے فکر رہو نی۔ ابھی ہم تم کو منزل تک پہنچا دے گا۔ بس راستے میں رولا نہیں کرنے کا ہے۔ ادھر سمندر میں نیوی والوں کے جہاز مہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ ہم کو نہ دیکھ لیویں۔''

''اگر کسی جہاز والے نے ہمیں دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟'' ایک مسافر نے دریافت کیا۔

''اڑے بابا! اس کو بولنے کا ہے کہ ہم لوگ مچھلیاں وچلیاں پکڑنے نکلا ہے'' اس نے کہا۔

''دیکھ لیا استاد!'' میں نے استاد سے پھر سرگوشی کی ''یہ لوگ دھوکے باز ہیں۔''

''اب مجھے واشگے ہوتا تھا'' استاد نے کہا ''میں تو گرفتار سوز دبرلن تھا۔''

کشتی چلتی رہی۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں لے جا رہے تھے۔ ہم نے ساری رات اسی کشتی پر گزار دی تھی۔ صبح ہوئی تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر دیکھ کر ہمیں ہول آنے لگا تھا۔ استاد نے بھی ایسا سماں کہاں دیکھا ہوگا۔ ان کی بھی ٹانگیں

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

کانپنے لگی تھیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے تھے۔ شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے۔ اس وقت مجھے ان کی حماقت پر بے پناہ غصہ آرہا تھا اور اپنے آپ کو کوسنے کو دل چاہ رہا تھا۔ آخر کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ میں استاد کے اس پاگل پن میں ان کے ساتھ ہو جاؤں۔

وقت اور پیسوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ اب تو جان بھی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

ستم بالائے ستم کہ جو سمندر اب تک پُرسکون تھا' وہ اچانک بپھر اٹھا۔ اتنی بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگیں کہ کشتی ان کے سامنے بے حقیقت ہوتی چلی گئی۔ دونوں ناخدا کشتی کو سنبھالنے میں لگ گئے تھے اور ہمارا یہ حال تھا کہ ادھر سے ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ آنتیں جیسے حلق میں آ گئی ہوں اور اس وقت استاد نے اپنی خاص زبان میں چنگھاڑنا شروع کر دیا ''اے نامعقول' نابکار' طفل مکتب' انا بحر او قیانوس۔ چشم خورد و کلاں۔ بہ ہوش و گوش۔ یہ بحر مردار یدکس قماش کے ابنائے افشار کر رہا ہے۔''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں استاد'' میں اپنے پیٹ کو دباتے ہوئے بولا ''اس وقت آپ کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہیں۔''

''خبردار!'' استاد چنگھاڑے ''میں آخری تاجدار ہندو برصغیر ہوں۔ ہمیں کچھ نہیں نقصاناتِ ازالہ ہوگا۔ ہم بہ خیر و عافیت جاں اس قریۂ رسوا وشڈیوا سے مباہلہ جاں ہو جائیں گے۔''

''ارے یہ بابا کیا بول رہا ہے؟'' ایک ناخدا نے پوچھا۔

''یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا'' میں نے بتایا ''یہ کشتی کنارے پر لگ جائے گی۔''

دوسرے مسافروں نے بھی یہ بات سن لی تھی۔ وہ سب استاد کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت استاد نے ایک اور پینترا بدلا' وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس طرح بولنے لگے تھے جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔

اور واقعی حیرت انگیز طور پر وہ بپھرا ہوا سمندر پُرسکون ہونے لگا تھا اور ذرا سی دیر میں سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ دونوں ناخدا بھی بہت حیران دکھائی دے رہے تھے۔ پھر وہ دونوں استاد کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے ''اڑے او بابا! ہم کو معافی دے دو'' ان میں سے ایک نے کہا ''اس ایجنٹ نے ہمارے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ہمیں کسی بابا کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ ہمارا تو بخشش بھی نہیں ہوئیں گا۔''

''کیا کہا تھا اس ایجنٹ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بولا تھا کہ اس کھیپ کو کسی ٹاپو پر اتار کر وہاں سے بھاگ آنا ہے'' ناخدا نے بتایا۔

ہم سبھوں کا برا حال ہو رہا تھا لیکن استاد پر اس وقت بے نیازی کی کیفیت طاری تھی۔ ''اب ہم تم لوگوں کو ساحل تک واپس لے جاتا ہے'' ناخدا نے کہا ''ہم اس بابا کے ساتھ ہوشیاری نہیں کر سکتا۔ یہ تو سمندر کو بھی قابو میں کر لیتا ہے تو ہم کیا چیز ہے۔''

اور وہی ہوا' ہم سبھوں کو دوبارہ ساحل پر لا کر اتار دیا گیا تھا۔ سب کے سب استاد کے ہاتھ چوم رہے تھے اور استاد کی پھر وہی بے نیازی کی کیفیت تھی۔ دونوں ناخدا استاد سے بار بار معافیاں مانگ رہے تھے جبکہ مسافر استاد کے بے پناہ عقیدت مند ہو گئے تھے کیونکہ استاد ہی کی وجہ سے سمندر کی لہریں شانت ہوئی تھیں۔ (ان کے خیال کے مطابق)

یہ غنیمت تھا کہ ہم سبھوں کے پاسپورٹ ابھی ہمارے ہی پاس تھے ورنہ بڑی مصیبت ہو جاتی۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔

میں نے استاد کے محل پہنچ کر ان سے دریافت کیا ''استاد ایک بات تو بتائیں' یہ آپ نے اتنا بڑا دعویٰ کیسے کر دیا تھا کہ کشتی کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم احمقِ عظیم ہو'' استاد مسکرا دیے ''میاں' جب کشتی غرقِ آب ہو جاتی تو پھر کون ہمارا حساب لینے والا تھا کہ آپ نے یہ بات غلط کیوں کی؟''

استاد نے انتہائی آسان الفاظ میں یہ نکتہ سمجھا دیا تھا اور اس وقت احساس ہوا کہ استاد کی حکمتِ عملی ہمارے کام آ گئی تھی' انہوں نے بابا بن کر ایک بہت بڑا کام کر دکھا دیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع ہوگا جب استاد کو کسی معاملے میں چوٹ ہوئی ہوگی۔ وہ تو استاد کی جعلی بزرگی ہمارے کام آ گئی ورنہ ہم کسی ویران ٹاپو پر زندگی گزار رہے ہوتے۔

اس دن کے بعد سے استاد کے سر سے باہر جانے کا بھوت اتر گیا تھا اور خاص طور پر برلن سے انہیں چڑ ہو گئی تھی۔ میں کبھی کبھی انہیں چھیڑنے کے لیے ان سے کہتا ''استاد! کیا خیال ہے' برلن کا پروگرام بنائیں؟''

''ارے دفع کرو'' استاد جل کر کہتے ''برلن کون سا مقامِ افروزہ و جافزا ہے۔ وہ تو نشانِ بے راہ و ردیائے عاجلانہ ہے۔'' وہ اور پتا نہیں کیا کیا کہتے رہتے اور ان کی تقریر کا اصل متن یہ ہوتا تھا کہ ''دنیا کی سب سے تھرڈ کلاس جگہ صرف برلن ہے۔''

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

وہ آدمی ہنگامہ کررہا تھا۔ "یہ تم نے کیا بنادیا ہے' کیا چیز ہے یہ؟"

"یہ امتزاجِ لدّنی ہے" استاد مسکرا کر بتا رہے تھے۔ "اخراجِ کثیر سرمایہ رنگ و بو میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"کیا بکواس کررہے ہو تم! ایک تو تمہاری بات سمجھ میں نہیں آتی' اوپر سے تم نے میری یہ تصویر بنائی ہے۔ دنیا بھر کے رنگ تھوپ دیے ہیں۔ ایک آنکھ اتنی چھوٹی اور دوسری پورے کینوس پر پھیلی ہوئی ہے۔ خواہ مخواہ تم نے میرا وقت برباد کیا ہے۔"

"مردکِ گیری وہمزادِ بے اشوب" استاد کو بھی غصہ آگیا تھا "تو دنیا کے مقدرِ بے فیض و بے گمان کے بارے میں سرمایہ بے لنگ و نہنگِ بے آسرا بے بدل ہے۔ یعنی کچھ نہیں جانتا۔"

اس دلچسپ ہنگامے کو دیکھ کر بہت سے لوگ ان دونوں کے اِردگرد جمع ہوگئے تھے۔ استاد کی جناتی زبان لوگوں کی دلچسپی کا سبب بن گئی تھی۔ کچھ لوگ اس تصویر کو دیکھ دیکھ کر

مشہورِ زمانہ استاد محبوب نرالے عالم کے ایک شوقِ بے پناہ کا ماجرا

استاد محبوب نرالے عالم سے اب سرگزشت کے قارئین خوب واقف ہوچکے ہیں۔ اس بار استاد کو مصوری کا شوق چرایا ہے اور اس کے نتیجے میں کیا گل کھلے ہیں، وہ آپ خود بہ نفسِ نفیس ملاحظہ فرمائیے۔ ہم اگر کچھ عرض کریں گے تو آپ کا مزہ خراب ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لیجئے کہ کبھی کبھی کوئی فضول کام بھی فائدہ مند ثابت ہوجاتا ہے۔

شوقِ مصوری

منظر امام

ہنس رہے تھے جو استاد نے اس بندے کی بنائی تھی۔ تصویر کے ساتھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کینوس پر رنگ کے ڈبے الٹ کر درمیان میں دو بے تکی آنکھیں بنادی گئی تھیں اور استاد اس بات پر بضد تھے کہ یہ اس کا چہرہ ہے۔

اتفاق تھا کہ میں بھی ادھر سے گزرا اور استاد اور لوگوں کو دیکھ کر رک گیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ تماشا استاد کے دم سے ہو رہا ہوگا۔ استاد کا بالکل نیا روپ سامنے آیا تھا۔ ایک ایزل، کینوس، رنگوں کے ڈبے اور برش وغیرہ لیے انہوں نے شہر کی ایک فٹ پاتھ پر اپنی مصوری کی دکان کھول لی تھی اور ماڈل کو سامنے بٹھا کر اس کا پورٹریٹ یا تصویر بنانے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ کہاں استاد اور کہاں مصوری۔ انہوں نے اس بندے کی تصویر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور ستم ظریفی یہ کہ اپنی جناتی زبان میں اس کو برا بھلا بھی کہے جا رہے تھے۔

بہرحال کچھ دیر بعد وہ آدمی جھک جھک، بک بک کرتا... ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا کوئی مالی نقصان تو نہیں ہوا تھا لیکن استاد نے اس کا اچھا خاصا وقت ضرور برباد کر دیا تھا۔ میں استاد کے سامنے نہیں گیا۔ ایک طرف کھڑے ہو کر ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے خود اس وقت استاد کے سامنے جا کر شرمندگی ہی ہوتی کیونکہ لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ان کی جناتی زبان پر حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

استاد نے ایزل اور کینوس اٹھایا۔ رنگوں کے ڈبے اٹھائے۔ اور ایک طرف چل دیے، ابھی وہ کچھ دور گئے تھے کہ میں تیز قدموں چلتا ہوا ان کے پاس پہنچ گیا۔ "استاد!" میں نے انہیں آواز دی "یہ سب کیا ہے، یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟؟"

استاد نے اس موقع پر اپنی جناتی زبان میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ استاد نے کہیں سے مرزا غالب کا وہ شعر سن لیا تھا کہ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔ تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے۔ تو استاد نے یہ سوچا کہ کیوں نہ مصوری شروع کر دی جائے۔ اس طرح مہ رخوں سے ملاقات کے ساتھ ساتھ روزی روٹی کا سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔

"استاد!" میں نے ان کی داستان سمجھتے ہوئے کہا "مصوری اس طرح نہیں ہوتی کہ رنگ اور برش لیا اور شروع ہو گئے اور وہ بھی پورٹریٹ وغیرہ۔ اس فن کی باقاعدہ تربیت لینی پڑتی ہے۔"

"لیکن میرے مزاجِ بے دخل میں کوزۂ مصوری نمایاں ہے" استاد نے کہا۔ مطلب یہ تھا کہ مصوری ان کے مزاج کو راس آتی ہے۔

"تو استاد، ایسا کریں آپ کیمرے سے تصویریں اتارا کریں" میں نے مشورہ دیا "یعنی فوٹو گرافر بن جائیں۔ وہ بھی بہت بڑا فن ہے۔ اس میں بھی مہ رخوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اور روزگار کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر شریکِ دخترِ انصرام کیمرا کر دو" یعنی کیمرے کا بندوبست کر دو۔

میرے بڑے بھائی نے گزشتہ برس مجھے ایک کیمرا تحفے میں لا کر دیا تھا۔ وہ میرے لیے اس لیے بے کار تھا کہ تصویریں کھینچنے کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ میں نے وہی کیمرا استاد کے حوالے کر دیا۔ "یہ لیں استاد! اس میں ریل ڈلوائیں اور شروع ہو جائیں۔"

"واہ میاں، دوست آمد کہ گدائی طفلانِ شہر" استاد نے خوش ہو کر نہ جانے کیا کہہ دیا تھا "اب تم قصرِ مباہاتِ بے عمل دیکھنا، آج شام پروردۂ پارک عنقریب میں آجاؤ۔"

استاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ آج ہی سے کیمرے کے ذریعے کام شروع کر دیں گے اور انہوں نے مجھے قریب کے پارک میں بلا لیا تھا تاکہ میں ان کا ہنر دیکھوں۔

میں یہ سمجھ گیا تھا کہ استاد نے کیمرا ورک کے لیے پارک کا انتخاب کیوں کیا ہوگا۔ پارکوں میں نوجوان جوڑے آیا کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تصویریں اتروانے کے شوقین بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا آدمی گھومتا ہوا نظر آجاتا ہے جس کے پاس پولورائڈ کیمرا ہوتا ہے۔ وہ فوری طور پر تصویریں اتار کر تصویریں حوالے بھی کر دیتا ہے۔ استاد بھی اس کیمرے کو ایسا ہی کیمرا سمجھ رہے تھے۔

"استاد! آپ غلط سمجھ رہے ہیں" میں نے بتایا "یہ وہ کیمرا نہیں ہے" پھر میں نے انہیں عام کیمرے اور پولورائڈ کیمرے کا فرق سمجھا دیا۔

"ہاں، ہاں۔ میں بھی عاقلانِ بے جہل نہیں ہوں۔" استاد نے کہا "میں شبۂ سخن ہوں۔ میں بھی اس کیمرے سے تصویرِ بتانِ بے رنگ کروں گا اور اپنا کارڈ میں ایڈریس اور پتے کے اس کے حوالے کر دوں گا کہ تصویرِ سخن شناس کو وجہ دستورِ قدم بوس کرلے۔"

میرا خیال ہے کہ آپ بھی اتنے دنوں سے استاد کے کارنامے پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کہ استاد کے اس جملے کا مفہوم کیا ہو سکتا تھا۔ اگر نہیں تو میں یہ تشریح کردوں کہ استاد نے یہ فرمایا تھا کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ کیسا کیمرا ہے۔ وہ اس کیمرے سے تصویر کھینچ کر اپنا کارڈ تصویر اتروانے والے کے حوالے کردیں گے کہ وہ اس پتے پر آکر اپنی تصویریں لے جائے۔

استاد کا یہ آئیڈیا بہت زبردست تھا۔ اس سے یہ سمجھا جاتا کہ استاد باقاعدہ فوٹوگرافر ہیں اور ان کی کوئی شاپ وغیرہ بھی ہے "خیال تو بہت اچھا ہے استاد!" میں نے تعریف کی "لیکن اتنی جلدی کارڈ کہاں سے آجائیں گے؟"

"یہ فکرِ خوبانِ فضولب" استاد نے کہا "میرے کئی احباب وابستۂ روزگارِ طباعت و ثقافت ہیں۔ وہ فوری' جلدی اور لمحاتی کام کردیں گے۔"

مطلب یہ تھا کہ استاد کے کئی دوست پرنٹنگ پریس وغیرہ سے منسلک تھے۔ وہ فوری طور پر استاد کے کئی کارڈز شائع کرسکتے تھے۔ بہرحال استاد نے تاکید کی تھی کہ میں شام کے وقت پارک پہنچ جاؤں تاکہ استاد کے ہنر کا کمال دیکھ سکوں۔

میں وقت پر پارک پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ استاد نے واقعی ایک جوڑے کو گھیر رکھا تھا۔ اور ان بے چاروں کی جان عذاب میں آئی تھی۔ استاد اپنی جناتی زبان میں ان سے طرح طرح کے پوز بنوائے جارہے تھے۔

"ناہنجارو' فربہ اندامو' کمر کو روئے چشمِ یار کی طرف رکھو اور تم اپنا دایاں ہاتھ بہ طریقتِ بازوپر تمثالِ بے امان کرو۔"

"کیا بولے جارہے ہیں آپ؟" مرد جھلا کر بول پڑا "آپ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ ذرا آسان بات کریں۔"

"آسان یہ ہے کہ دستِ گر کو ساتھ چشمکِ بے حجاب رکھو" استاد نے دوسرا حکم دیا۔

میں ایک طرف کھڑا استاد کی باتیں اور ان دونوں کی بے بسی دیکھ رہا تھا۔ ہنستے ہنستے میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ استاد بوکھلا بوکھلا کر اس وقت کچھ زیادہ ہی عجیب و غریب زبان استعمال کیے جارہے تھے۔ جو شاید فرشتوں کی بھی سمجھ نہیں آسکتی ہو۔ بہرحال خدا خدا کرکے یہ مرحلہ طے ہوا اور استاد نے ان دونوں کی کچھ تصویریں بنالیں۔ تصویریں اتروانے کے بعد وہ دونوں استاد کے پاس آگئے "اب یہ تصویریں کب ملیں گی؟" اس مرد نے پوچھا۔

استاد نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر دونوں کی طرف بڑھادیا "اب آپ دولتِ خانہ پر بر محل ہوجائیں۔ وہیں آپ کی تصویریں کھینچوں گا۔"

"کیا مطلب؟" عورت جھلاگئی تھی "اب تم دوبارہ تصویریں کھینچوگے؟"

"ہاں' کیونکہ اس کیمرے بے امان و بے نشان میں ریل نہیں ہے" استاد نے بتایا۔

ان دونوں نے اپنے سر پیٹ لیے تھے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ استاد کی گردن دبادیتے۔ بہرحال ان دونوں نے مل کر اتنا ہنگامہ کیا کہ استاد کی جان چھڑانے کے لیے مجھے آنا پڑا۔ خود مجھے اس بات پر حیرت ہورہی تھی کہ جب کیمرے میں ریل ہی نہیں تھی تو استاد نے ان دونوں سے اتنی ورزش کس خوشی میں کرائی تھی۔ بہرحال بہت دیر کی بک بک کے بعد پتا چلا کہ استاد تصویریں کھینچنے کی پریکٹس کررہے تھے اور یہ پہلا مرحلہ تھا کہ وہ لوگوں کو مختلف پوز بنانا سکھا رہے تھے۔

وہ دونوں استاد کو برا بھلا کہتے ہوئے ایک طرف روانہ ہوگئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے استاد سے کہا "استاد' بہتر ہے کہ آپ یہ کام رہنے ہی دیں۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اس طرح کی حرکتیں کرتے رہے تو کسی دن بہت بری طرح پھنس جائیں گے۔"

"مردکِ بے نشاں اور آمادہ..." استاد نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس بس" میں نے استاد کو مزید بولنے سے منع کردیا "ایک تو آپ کی یہ جناتی زبان آپ کا بیڑا غرق کردے گی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ آپ کی یہ گفتگو سن کر کوئی بھی آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ اگر گاہکوں سے بات کرنی ہے تو آسان الفاظ میں کریں اور کیمرے میں ریل بھی رکھا کریں۔ اس کے علاوہ پہلے کچھ دنوں تک بے جان چیزوں کی تصویریں اتار کر پریکٹس بھی کرلیں۔"

"کیوں' میں بے جان کو دشنۂ آلام کیوں کروں؟" استاد نے پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ آپ بے جان کے ساتھ جو بھی سلوک کریں گے' وہ برا نہیں مانے گا" میں نے کہا "اس کے علاوہ آپ کو تصویریں کھینچنے کی پریکٹس بھی ہوجائے گی۔"

میرا یہ مشورہ استاد کی سمجھ میں آگیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس مشورے کی قیمت خود مجھ ہی کو ادا کرنی پڑی تھی یعنی خود میں نے ہی استاد کے کیمرے میں ریل ڈلوادی تھی۔ اس کے بعد کئی دنوں تک استاد سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ نہ جانے وہ تصویریں کھینچنے کے شوق میں کہاں چلے گئے تھے۔

ایک دن ایک واقف کار مجھے راستے میں مل گئے۔

وہ ایک پڑھے لکھے معقول انسان تھے۔ کسی اسکول میں پڑھایا کرتے۔ سفید پوش' شریف' میں کئی بار ان کے گھر بھی جاچکا تھا۔ ان کی دو صاحب زادیاں تھیں۔ بڑی کو شاعری کا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

بھی شوق تھا، نگہت نام تھا اس کا۔

ان صاحب کا نام رحمت اللہ تھا۔ خاصے زندہ دل انسان تھے۔ ایسے لوگ ہر حال میں اپنے ہونٹوں پر تبسم سجائے رہتے ہیں۔ چاہے ان کی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن اس وقت انہیں دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں سرخ، کپڑے شکستہ۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں ان کو دیکھتے ہی لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا "رحمت اللہ صاحب! خیریت تو ہے" میں نے پوچھا "یہ.... آپ نے کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"حال!" وہ مجھے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئے تھے "نہیں تو' ٹھیک تو ہوں۔"

"نہیں رحمت اللہ صاحب' آپ ٹھیک نہیں معلوم ہو رہے" میں نے کہا "کچھ پریشان سے ہیں۔ بتائیں مجھے' میں شاید آپ کے کسی کام آسکوں؟"

میری ان ہمدردانہ باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ رحمت اللہ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ پتا یہ چلا کہ ان کی بیٹی نگہت کہیں غائب ہو گئی تھی اور کوشش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ پولیس میں رپورٹ بھی درج کرادی گئی تھی اور رحمت اللہ صاحب اس وقت اخبار میں اشتہار دینے کے لیے جا رہے تھے۔

"رحمت اللہ صاحب! یہ تو بہت افسوس ناک خبر سنائی آپ نے" میں نے کہا "خدا آپ کی مشکل آسان کرے۔ نگہت تو بہت پیاری بچی ہے۔"

میں اس کے علاوہ ان سے اور کیا کہہ سکتا تھا۔ اس وقت میں ان کے ساتھ ہی ہو لیا۔ اخبار والوں سے میری جان پہچان تھی اور مجھے امید تھی کہ میری وجہ سے ان کو تھوڑی سی آسانی ہو جائے گی۔

میں کس دل سے ایک ایسے باپ کے ساتھ چل رہا تھا جس کی پیاری بچی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ رحمت اللہ صاحب سے تفصیل معلوم کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ویسے میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نگہت کوئی غلط قدم اٹھانے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ یقیناً کوئی سانحہ پیش آگیا ہوگا۔

بہرحال اخبار کے دفتر جا کر میں نے رحمت اللہ صاحب کے اشتہار کی بات کی اور انہیں رکشے میں بٹھا کر رخصت کر دیا۔ اس وقت خود میرا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میں گھر پہنچا تو استاد بڑی بے قراری سے میرے انتظار میں ٹہل رہے تھے۔ "ارے بھائی' تم کہاں فروغِ ماہی گل اندازِ فراق ہو گئے تھے؟" یعنی کہاں چلے گئے تھے؟

"بس استاد! یوں ہی ایک کام سے چلا گیا تھا" میں نے کہا۔ میں نے انہیں بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"دیکھو۔ میں تمہارے لیے ایک گلِ فراز افتاد لایا ہوں" استاد نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا لفافہ مجھے دکھایا۔

"کیا ہے استاد اس میں؟"

"اس میں سکونِ بے آب و گیاہ تصاویرِ خوردہ فروشانِ بے ہمت ہے" استاد نے کہا "ان کی تلاش معاش میں کیمرا بے دھڑک اور بے سڑک کو لے کر بہ عنوان تجویز کنندہ ہوتا رہا ہوں اور سوگوارانِ بے ملک و بے آب و بے گیاہ ہوں۔"

استاد بہت دیر تک نہ جانے کیا کیا بولتے رہے۔ ان کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ انہوں نے کیمرے میں ریل ڈلوا کر مختلف چیزوں کی تصویریں کھینچنی شروع کر دی ہیں اور ہر تصویر کو اپنے مزاج کے مطابق ایک عنوان بھی دیا ہے۔ اور ان تصویروں کے لیے وہ پورے شہر میں گھومتے پھر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بہت بے دلی سے ان کی اتاری ہوئی تصویریں دیکھی تھیں۔ چند تصویریں تو بہت دھندلائی ہوئی تھیں۔ چند واضح تھیں' کسی میں کوئی فقیر تھا' کسی میں کوئی درخت۔ کسی میں کچھ اور۔ لیکن ایک تصویر ایسی تھی جس کو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا تھا۔ وہ تصویر نگہت کی تھی۔ سو فیصد وہی جو کسی سلاخوں والی کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔

"استاد! یہ... یہ تصویر کہاں سے لی؟"

"بس ایک پرندۂ بے دام و بے ہنر دکھائی دے گئی تھی" استاد نے بتایا۔

"استاد خدا کے لیے یہ بتائیں' یہ تصویر کہاں کی ہے' یہ لڑکی کس گھر میں تھی؟"

استاد اپنی جناتی زبان میں بہت دیر تک نہ جانے کیا کیا بولتے رہے۔ بالآخر پتا یہ چلا کہ یہ تصویر انہوں نے مضافات کے ایک ایسے گھر کی اتاری ہے' جس کے اردگرد اور کوئی مکان نہیں تھا۔

میں نے فوراً رحمت اللہ صاحب کو بلا لیا۔ رحمت اللہ صاحب نے پولیس کو اطلاع دی۔ فوری طور پر اس مکان پر چھاپا مارا گیا اور پتا چلا کہ نگہت کو راہ چلتے ہوئے اغوا کر لیا گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار استاد کا کوئی ہنر اتنے بڑے کام میں آیا تھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

شہزادے کا اغوا

منظر امام

اُن مُجرموں کی شامتِ اعمال کا احوال جو اُستاد کو بڑی موٹی آسامی سمجھ رہے تھے اور اُن کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے تاکہ اُستاد کی رہائی کے بدلے پانچ کروڑ روپے تاوان وصول کرسکیں۔ اُستاد نے اُنھیں بتایا تھا کہ وہ شہزادۂ مملکتِ ادبِ عالیہ ہیں اور بے شمار دولت کے مالک ہیں۔

قصہ اُستاد محبوب نرالے عالم کی اُداسی اور اغوا کا

ان لوگوں نے ایسے حلیے کا انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ دونوں ایک پارک میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اس شخص کو ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دیکھ لیا۔ لانبی بے ہنگم داڑھی، سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے، لانبا سیاہ چغا، گلے میں ایسے دانوں کی مالا جس کے دانے چھوٹی گیند کے برابر تھے۔

"یار، یہ کیا چیز ہے؟" ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"پتا نہیں" دوسرے نے اپنی گردن جھٹکی "چلو چل کر تفریح لیتے ہیں۔ یہ کوئی جعلی پیر وغیرہ معلوم ہوتا ہے۔"

دونوں بینچ سے اٹھ کر اس آدمی کے پاس پہنچ گئے "کیا حال ہے جناب!" ان میں سے ایک نے اس شخص کو مخاطب کیا۔

"من ستم ستار اقراطالیس و قلوبِ حزیں بہ مثال ادراک خور ہوں" اس آدمی نے اپنی گردن جھٹکتے ہوئے

جواب دیا۔

"کیا!" وہ دونوں حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ آدمی کیا بول گیا ہے "آپ کون ہیں جناب!" ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے دریافت کیا۔

"ایں چہ ہمہ استاد محبوب نرالے عالم شہزادہ عالی تبار آنجہانی ہیں" اس آدمی نے جواب دیا جو دراصل استاد محبوب نرالے عالم ہی تھے۔

ان دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور دونوں استاد کے پاس سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر آگئے۔

"یہ کیا سلسلہ ہے؟" ایک نے حیرت ظاہر کی "یہ شخص کہیں پاگل تو نہیں ہے۔"

"نہیں، پاگل ایسے نہیں ہوتے" دوسرے نے اپنا خیال ظاہر کیا "یہ واقعی کسی جگہ کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی باتیں نہیں سنیں؟"

"وہی تو سمجھ میں نہیں آرہیں۔"

"یہی تو اس کے شہزادہ ہونے کا ثبوت ہے" پہلے والے نے کہا "میرا خیال ہے کہ کسی وجہ سے یہ اپنی ریاست سے نکال دیا گیا ہے اس لیے اس نے اپنے آپ کو تبدیل کر رکھا ہے۔ اپنا حلیہ بگاڑ کر گھوم رہا ہے۔ کیوں نہ ہم اسے باس کے پاس لے چلیں۔ اگر یہ کام کا بندہ ہوا پھر تو مزے آجائیں گے۔ اگر یوں ہی ہوا تو کیا فرق پڑے گا، اسے دھکے دے کر باہر نکال دیں گے۔ ٹرائی کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

"ٹھیک ہے" دوسرے نے بھی تائید کر دی "لیکن یہ تو سوچو کہ ہم اسے لے کر کیسے جائیں گے؟"

"آؤ میرے ساتھ۔"

دونوں پھر استاد کے پاس پہنچ گئے جو اس وقت مراقبے کی پوزیشن میں بیٹھے تھے "جناب عالی!" ایک نے بڑے ادب سے استاد کو مخاطب کیا "ہم آپ کی باتیں تو سمجھ نہیں سکتے لیکن اتنا ضرور اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ کہیں کے شہزادے ہیں اور آپ کو ابھی تک اپنا حق نہیں ملا ہے۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں۔ ہمیں آپ کی خدمت کر کے بہت خوشی محسوس ہوگی۔"

"میں تو منجملہ ارباب سوختنی ہوں" استاد نے آنکھیں کھول کر دونوں کی طرف دیکھا "جہاں لے چلوگے، حاضر باش وشب دیگ ہوں۔"

ان دونوں نے استاد کا مفہوم سمجھ لیا کہ وہ ان کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ دونوں استاد کو پارک سے باہر کھڑی ہوئی ایک گاڑی میں لے آئے۔ استاد پر اس وقت بے نیازی اور مراقبے کی کیفیت طاری تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بالکل خاموش سفر کرتے رہے۔ انہیں اس بات کی پروا ہی نہیں تھی کہ وہ دونوں کون ہیں اور انہیں اپنے ساتھ کہاں لے جا رہے ہیں۔

استاد پر گزشتہ دنوں سے اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ اس اداسی کی وجہ یلا لیلیاں یعنی وہ خواتین تھیں۔ جنہوں نے انہیں کوئی لفٹ نہیں دی تھی۔ ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ایک دن استاد جب ایسی خواتین کا حساب کتاب لگانے بیٹھے تو ان کے ہوش اڑتے چلے گئے۔ ان کے حساب کتاب کی صورت حال کچھ یوں تھی۔

انہوں نے سوچا۔ اس ملک میں کم از کم پانچ کروڑ عورتیں ہوں گی۔ اسی طرح ہندوستان میں، برما میں، بنگلہ دیش میں غرضیکہ پوری دنیا میں ان کے حساب کے مطابق دو ارب چالیس کروڑ اٹھارہ لاکھ عورتیں تھیں اور اتنی ہی عورتوں کا ان کی جوانی سے لے کر اب تک انتقال ہو چکا ہوگا یعنی چار ارب اسی کروڑ چھتیس لاکھ عورتوں میں سے اب تک کسی نے بھی ان کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

یہ کتنا بڑا زیاں تھا۔ کتنی بڑی بربادی تھی۔ شاید وہ کسی قابل ہی نہیں تھے یا ان کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا کہ ان کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اپنے حساب سے اعلیٰ ترین شاعری بھی کی تھی۔ اس کے باوجود حلقۂ خواتین میں انہیں مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ ان ہی باتوں نے انہیں اداس کر رکھا تھا۔ اسی اداسی کے عالم میں وہ پارک میں درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے تھے کہ دو بندے انہیں پکڑ لائے اور اب وہ انہیں کسی طرف لے جا رہے تھے۔

راستے میں جب گاڑی کو جھٹکے لگتے تو استاد آنکھیں کھول کر کسی چوکنے پرندے کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ یہ راستے ان کے جانے پہچانے تھے۔ انہوں نے برسوں ان ہی راستوں کی خاک چھانی تھی۔ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس وقت وہ کس محلے سے گزر رہے ہیں اور انہیں کس محلے کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ بالآخر سفر کا اختتام ایک بڑے سے مکان کے گیٹ پر ہوا تھا۔ استاد کو وہ جگہ بھی اچھی طرح معلوم تھی۔

گیٹ کھلا اور گاڑی کو گیٹ کے اندر لے جایا گیا پھر انہیں گاڑی سے اتار کر ایک بڑے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا، جہاں ایک خونخوار شکل کا آدمی پہلے سے موجود تھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استاد اس کی پروا کیے بغیر صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بھی بند کرلی تھیں۔

"کون ہے یہ؟" کمرے میں موجود خونخوار شکل والے نے استاد کو لانے والوں سے پوچھا "یہ تم کس کو پکڑ لائے ہو؟"

"باس۔ یہ بندہ کسی ریاست وغیرہ کا شہزادہ ہے" ایک نے بتایا۔

"کیا بکواس ہے۔ کیا شہزادے ایسے ہوتے ہیں؟ یہ تو مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔"

"آپ اس سے بات تو کر کے دیکھ لیں باس۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا اور زبان تو ایسی بولتا ہے جو صرف شہزادے ہی بول سکتے ہیں۔"

"اگر یہ کوئی بے کار آدمی ہوا تو تم دونوں کی کھال کھینچ لوں گا" باس نے انہیں تنبیہہ کی۔

استاد اس دوران میں بالکل بے نیاز بیٹھے ہوئے تھے بلکہ کچھ اور اداس ہو گئے تھے۔ ان کی تازہ ترین اداسی کا سبب یہ تھا کہ وہ یہ سوچ کر ان دونوں کے ساتھ چلے آئے تھے کہ جہاں انہیں لے جایا جا رہا ہے وہاں کوئی نہ کوئی خاتون ضرور موجود ہوگی لیکن یہاں ایک خونخوار صورت انسان سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ بہرحال اب تو وہ آ ہی گئے تھے۔

"کیا تم واقعی کسی جگہ کے شہزادے ہو؟" باس نے استاد کے قریب آ کر دریافت کیا۔

"ہاں۔ میں شہزادۂ مملکتِ ادبِ عالیہ ہوں" استاد نے ایک فخر کے ساتھ جواب دیا۔

استاد کو لانے والوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھا' ان کا اندازہ کتنا صحیح نکلا۔ وہ کتنے صحیح آدمی کو پکڑ کر لائے ہیں۔ باس ان دونوں کو لے کر ایک طرف آ گیا "ہاں۔ اس نے بتا تو دیا ہے کہ یہ شہزادہ ہے لیکن یہ ریاستِ ادبِ عالیہ کہاں ہے' میں نے تو آج تک اس کا نام نہیں سنا۔"

"باس! ہوگی کوئی چھوٹی موٹی ریاست لیکن ایسی ریاستیں بھی کروڑوں کی ہوتی ہیں۔ ہم ان کی دولت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے تو اس سے معلوم کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

باس پھر استاد کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ استاد نے اس وقت آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا اور ایک شانِ بے نیازی سے بولے "بندوبستِ ماحضر کیا جائے۔"

"جی شہزادے صاحب' کیا فرمایا آپ نے؟" باس نے دریافت کیا "کیا چاہیے آپ کو؟"

استاد نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لوگ بالکل جاہل ہیں۔ ان کی بات کبھی نہیں سمجھیں گے اس لیے انہوں نے زور زور سے اپنے پیٹ کو تھپ تھپانا شروع کر دیا۔ اشاروں کی یہ زبان فوری طور پر باس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے کوٹھی میں موجود ایک تیسرے آدمی کو استاد کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے روانہ کر دیا۔

"شہزادے صاحب' آپ کا یہ حال دیکھ کر بہت افسوس ہو رہا ہے" باس نے گھما پھرا کر اپنی بات شروع کی "کیا آپ کے پاس پیسے ویسے نہیں ہیں؟"

"میں دولتِ بے اندازہ کا مالک ہوں" استاد گرج کر بولے "خود میرے قبضے میں سترہ کروڑ نو لاکھ ہیں۔"

استاد نے اپنے طور پر کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ ان کے اپنے نظریئے کے مطابق ان کا ہر شعر دس ہزار روپوں کا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی پوری شاعری کو دس ہزار سے ضرب دے کر اس کی کل قیمت بتادی تھی۔ سترہ کروڑ نو لاکھ۔

اتنی رقم کا سن کر باس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ یہ تو بہت بڑی رقم تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس پھٹیچر انسان کے پاس اتنی رقم بھی

قلمی دوستی

ہزاروں حسین و جمیل لڑکے/لڑکیوں سے دوستی' تبادلہ تحائف' سیروسیاحت' میرج' بیرون ملک ملازمت' تعلیم' کاروبار' انعامی اسکیمیں' فلمی ستاروں کے ایڈریسز کے لئے۔

نام رسالہ	ملک جہاں چھپتا ہے	قیمت
کلثوم پین فرینڈ انٹرنیشنل	پاکستان	-/100 روپے
I.P.C	سویڈن	-/200 روپے
ورلڈ فرینڈز	کوریا	-/250 روپے
سگنل	فن لینڈ	-/300 روپے
A.S	امریکا	-/300 روپے

بینک ڈرافٹ محمد صادق کے نام ارسال کریں

مس فوزیہ پوسٹ بکس نمبر 3925 کراچی نمبر 4

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ہو سکتی ہے۔ اگر وہ زندگی بھر وارداتیں بھی کرتا رہتا تو بھی اتنی رقم اس کے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی۔

"لیکن مجھے یقین نہیں آرہا" باس نے کریدنے کے لیے کہا "آپ کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟"

"ناہنجار، سلفانوس، ارسطوفیدس، پامالیٔ دستِ ستم!" استاد اس پر برس پڑے "کیا تو مجھے دروغ بہ گردن راوی سمجھتا ہے۔ جا اس فون نمبر پر معلوم کرلے کہ میں کون ہوں اور میری کیا حیثیت تہ و بالا وادراکِ بے جہت ہے" انہوں نے ایک فون نمبر بھی بتادیا۔

یہ فون نمبر ان کے ایک دوست استاد بلما کا تھا۔ استاد بلما بھی ایک شاعر تھے اور پرانی کتابوں کی ایک دکان کے مالک تھے۔ وہ استاد کے بہت قدر داں تھے۔ باس نے اسی وقت وہ نمبر یاد کرلیا تھا پھر اس نے اسی کمرے سے وہ فون نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے استاد بلما ہی نے ریسیور اٹھایا تھا "ہیلو۔ کون صاحب؟"

"جناب! آپ سے ایک آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں" باس نے کہا "لانبی داڑھی، بڑھے ہوئے بال، جسم پر ایک چغا۔ اپنے آپ کو شہزادہ ادبِ عالیہ کہتا ہے۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"بدبخت، ادب سے نام لے" استاد بلما نے دوسری طرف سے اسے جھڑک دیا "وہ واقعی شہزادۂ ادبِ عالیہ ہیں۔ نابغہ روزگار۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، کہیں تب جاکے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ اس کے علاوہ استاد کی ذاتِ والا صفات کے لیے ایک اور شعر..."

استاد بلما نے دوسرا شعر سنانا شروع ہی کیا تھا کہ باس نے فون بند کردیا۔ اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ استاد کی شہزادگی کنفرم ہوگئی تھی۔ استاد کے ساتھ اس کا رویہ بہت مؤدّبانہ بلکہ خوشامدانہ ہوگیا۔ اس نے فوراً استاد کے لیے ایک کمرا مخصوص کرادیا جہاں استاد کی سہولت کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔

"یہ شخص کروڑوں کی آسامی ہے" اس نے اپنے آدمیوں کو بتایا "اس کا پورا پورا دھیان رکھنا ہے۔ کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ ہم اس کے عوض اس کے آدمیوں سے چار پانچ کروڑ تو وصول کر ہی لیں گے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی باس!" ایک آدمی نے اپنی تشویش سے آگاہ کیا "اگر یہ بندہ کروڑوں کی آسامی ہے تو اس کا اتنا برا حال کیوں ہو رہا ہے؟ اس کے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں۔"

"یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی" باس نے کہا "لیکن اب میں فون پر بات کرکے مطمئن ہوگیا ہوں۔ بہت سے شہزادے قسم کے لوگ بالکل خبطی ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے بھیس بدل کر گھومتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ بندہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ بعض لوگ دولت کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں دولت سے وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ ایسا ہی آدمی ہے۔ یہ دولت پر لات مار کر اپنے گھر سے نکل آیا ہے اور اب اس کی دولت ہمارے کام آئے گی۔"

وہ سب بہت خوش تھے۔ انہیں استاد کی صورت ایک خزانے کی چابی مل گئی تھی۔ جبکہ استاد کو ان سب باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ ان کے لیے یہی بہت تھا کہ اس گھر میں ان کی خوب خاطر ہو رہی ہے۔ رہنے کے لیے بہت اچھا کمرا دیا گیا تھا۔ کھانا بھی بہت زبردست تھا۔ جب استاد کی کوشش کے بغیر یہ سب کچھ مل رہا تھا تو انہیں پھر اور کیا چاہیے تھا۔

استاد نے اس کمرے میں بیٹھے بیٹھے کئی غزلیں بھی موزوں کی تھیں۔ اس رہائی کے بعد استاد کا یہ کہنا تھا کہ ان کی شاعری کے لیے قید کی فضا بہت مناسب ہوتی ہے۔ اگر وہ پابندی سے اسی طرح کہیں قید ہوتے رہے تو انہیں شاعری میں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

باس اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کررہا تھا۔ مسئلہ یہی تھا کہ استاد کے عوض کس طرح چار پانچ کروڑ وصول کیے جائیں۔

"ہمارے پاس ایک راستہ تو ہے باس!" ایک نے کہا "وہی فون نمبر۔ ہم اس پر اطلاع دے دیں کہ شہزادہ محبوب ہمارے قبضے میں ہیں۔ اگر ان کی سلامتی چاہتے ہو تو پانچ کروڑ روپے فلاں جگہ پہنچا دیے جائیں۔"

"بے وقوف۔ یہ تو میں بھی کرسکتا ہوں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس آدمی کا فون نمبر ہمیں دیا گیا ہے، کیا وہ شہزادے کا خاص آدمی ہے یا بس یوں ہی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر وہ خاص آدمی نہیں ہوا... تو کسی خاص آدمی تک یہ پیغام پہنچادے گا۔"

یہ بات باس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے اسی وقت استاد بلما کا نمبر ملا دیا۔ استاد بلما بھی جیسے فون کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ریسیور اٹھانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی "ہیلو۔ کون بول رہا ہے؟" انہوں نے اپنی مخصوص کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ لوگوں کو شہزادے محبوب کے بارے میں ایک خبر

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

دینی ہے" باس نے کہا۔

"شہزادے محبوب کی بات ہی نہ کریں۔ وہ بادشاہ آدمی ہیں۔ ویسے وہ خبر کیا ہے؟"

"آپ یہ بتائیں' وہ اگر اچانک غائب ہو جائیں تو پھر کیا ہو؟"

"پھر تو بہت برا ہوگا" استاد بلما نے کہا "ہم سب بے موت مارے جائیں گے۔"

"تو پھر یہ سن لو کہ تمہارے شہزادے اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم نے ان کو اغوا کرلیا ہے۔"

"کیا!" استاد بلما نے بوکھلا کر پوچھا۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ کوئی شخص استاد محبوب نرالے عالم کو بھی اغوا کرسکتا ہے' یہ ان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ انہیں اس بات پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ استاد کو اغوا کرنے والوں کی ذہنی حالت ابھی تک ٹھیک کیسے ہے۔ وہ استاد کی باتیں سن سن کر پاگل کیوں نہیں ہو گئے "ارے... کیا کہہ رہے ہو بھائی!" استاد بلما نے تصدیق کرنی چاہی "کس کو اغوا کرلیا ہے اور کیوں؟"

"تمہارے شہزادے محبوب کو" باس نے اپنی بات دہرائی "اور ان کی رہائی اس وقت ہوسکتی ہے جب ہمیں پانچ کروڑ روپے دیے جائیں گے۔ کیسے اور کب.... اس کے لیے تمہیں بعد میں فون کیا جائے گا۔"

استاد بلما ہیلو ہیلو کرتے رہ گئے۔ باس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

"کیا ہوا باس!" اس کے ایک آدمی نے دریافت کیا۔

"کیا ہونا ہے" باس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی "پہلا مرحلہ طے پا گیا ہے۔ میں نے تاوان کی رقم کی بات کرلی ہے۔ دوسرا فون بعد میں کروں گا۔ اس وقت میں شہزادے کے پاس جارہا ہوں تاکہ اس سے یہ معلوم کرسکوں کہ اس کی رہائی کے عوض کتنی رقم دی جاسکتی ہے؟"

استاد اس وقت اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز ایک فلم دیکھنے میں مصروف تھے۔ ان کے کمرے میں ٹی وی اور وی سی آر کا معقول انتظام تھا۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر ایک شعلۂ جوالہ رقص میں مصروف تھی۔ استاد بڑی محویت سے اسے دیکھے جارہے تھے۔ باس کی آمد بھی ان کی محویت کو ختم نہ کرسکی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں شہزادے صاحب!" باس نے بڑے ادب سے دریافت کیا۔

"آہ۔" استاد نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لی "اگر اس جیسی نازک مضطرب دوشیزۂ پُرجلال سامنے آکر کھڑی ہوجائے تو اپنے سترہ کروڑ نولاکھ کا خزانہ اس کے قدموں پر رکھ کروا رفتگانِ اجل کو لبیک کہہ جاؤں۔"

استاد کا یہ جملہ باس کی سمجھ میں آگیا۔ استاد یہ کہہ رہے تھے کہ اگر اس رقاصہ جیسی کوئی بھی خاتون ان کے سامنے آکر کھڑی ہوجائے تو وہ اپنی پوری دولت اس کے حوالے کردیں گے۔

"کک... کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں شہزادے صاحب؟" باس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"پھر وہی..." استاد نے ناراض ہو کر اس کی طرف دیکھا "ہم فی الفور مغفورِ طلب برکات بے سبب نہیں ہیں سمجھے؟"

باس کیا خاک سمجھتا' پھر بھی اس نے کمرے سے باہر دوڑ لگادی۔ اس نے اتنا ضرور سمجھ لیا تھا کہ استاد یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

"مزہ آگیا" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "میں نے تو صرف پانچ کروڑ کا حساب لگایا تھا اور یہاں پورے سترہ کروڑ ملنے والے ہیں۔"

"وہ کس طرح باس؟" اس کے آدمی یہ خوش خبری سن کر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

"میں جب شہزادے کے کمرے میں گیا تو اس وقت وہ ٹی وی پر فلم دیکھ رہے تھے" باس نے کہا "اسکرین پر ایک ڈانسر ڈانس کررہی تھی۔ شہزادے نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ اگر اس جیسی کوئی خاتون ان کے سامنے آکر کھڑی ہوجائے تو وہ اپنے پورے سترہ کروڑ نو لاکھ روپے اس کے قدموں پر رکھ دیں گے اور تجربے نے یہ ثابت کردیا ہے کہ شہزادہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے اگر یہ بات کی ہے تو اسے ہر حال میں پورا کرے گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے باس۔ لیکن ہم ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکے۔"

"ارے بے وقوف' میں اپنی ہونے والی بیوی اور موجودہ محبوبہ درخشاں کو شہزادے کے سامنے لاکر کھڑا کردوں گا۔ تم لوگ تو جانتے ہی ہو کہ وہ کتنی خوب صورت ہے اور پھر اسے شہزادے کے سامنے کھڑا ہی تو کرنا ہے' اس کے علاوہ اور کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے باس۔ تم ہی بہتر جانتے ہو' اسے فون کرکے بلالو۔"

باس نے اسی وقت اپنی محبوبۂ دلنواز کو فون کردیا تھا۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

اس نے ایک گھنٹے میں پہنچنے کا وعدہ کرلیا۔

دوسری طرف استاد بلما سخت ترین کشمکش میں مبتلا ہوچکے تھے۔ ان کے پاس جو فون آیا تھا' وہ کسی صورت بھی مذاق نہیں ہوسکتا تھا۔ استاد کے حوالے سے ایسا مذاق کون کرسکتا تھا! لیکن یہ پانچ کروڑ والی بات استاد بلما کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ایسا کون بے وقوف تھا جس نے استاد کو بھی کروڑپتی سمجھ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے کہ اس سلسلے میں انہیں کیا کرنا چاہیے۔ پھر انہوں نے پولیس کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا۔

انہوں نے دو باتیں سوچی تھیں۔ اگر یہ کسی قسم کا مذاق تھا تو کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ پولیس والے ڈانٹ ڈپٹ کرکے چلے جاتے اور اگر یہ سچ تھا تو ہوسکتا تھا کہ پولیس کی مداخلت سے استاد محبوب کی رہائی ہوجاتی۔ بس یہ سوچ کر وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔

وہ قانون کے سامنے سے گزرتے رہے تھے لیکن اندر آنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ انہوں نے قانون کے بارے میں کئی کہانیاں سن رکھی تھیں اسی لیے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کی حالت تو ویسے ہی خستہ تھی' تھانے پہنچ کر ان کا اور بھی برا حال ہورہا تھا۔ پسینے میں بری طرح بھیگے ہوئے تھے۔

تھانے دار نے انہیں دیکھتے ہی آواز لگائی "اے بند کرو اس کو' یہ کہیں سے بھاگ کر آیا ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کریں" استاد بلما تھانے دار کے آگے ڈھیر ہوگئے "میں تو استاد بلما ہوں۔ ایک کتب فروش۔ شاعر' معاشرے کا معزز فرد۔ ٹھہریں' میں آپ کو اپنی تازہ غزلیں سناتا ہوں۔ ان سے آپ کو میری سچائی کا یقین ہوجائے گا۔"

"اے رہنے دو اپنی شاعری۔ بات کیا ہے' یہاں کیوں آئے؟"

"وہ بات یہ ہے صاحب کہ پتا نہیں یہ کوئی بات بھی ہے یا نہیں۔ اگر بات ہے تو پھر بہت بری بات ہے۔ اگر بات نہیں ہے تو پھر کوئی بات نہیں ہے لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ایسی بات پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ چونکہ ایسی بات پہلے کبھی نہیں ہوئی اس لیے یہ بات......"

"کیا بکواس لگا رکھی ہے" تھانے دار گرج پڑا "کیا پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہو؟ صاف صاف کہو' کیا چکر ہے؟"

"وہ بات یہ ہے صاحب کہ شاید میرے دوست استاد محبوب نرالے عالم کو کسی نے اغوا کرلیا ہے" استاد بلما نے

سرکاری راز

روس میں ایک شخص نے سرِعام ایک اعلیٰ سرکاری افسر کو نکما اور احمق کہہ دیا' اسے دو جرائم کی سزا ملی' ایک جرم معزز شہری کی توہین کرنا تھا اور دوسرا جرم ایک سرکاری راز فاش کرنا۔

مرسلہ۔ رانا اشفاق احمد

لرزتی ہوئی آواز میں بتایا۔ وہ اس وقت کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہے تھے جب انہیں تھانے آنے کی سوجھی تھی۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی کہ استاد محبوب ہی اغوا ہوگئے۔

"کون ہے یہ استاد محبوب نرالے عالم۔ کیا وہ بھی تمہاری طرح پاگل ہے" تھانے دار نے اپنی آواز میں نرمی شامل کرتے ہوئے پوچھا۔ ویسے اس کی آواز کی نرمی بھی استاد بلما کو عارضۂ قلب میں مبتلا کردینے کے لیے بہت تھی۔

"ارے نہیں صاحب۔ وہ بہت مشہور آدمی ہیں" استاد بلما نے جلدی سے کہا "مغلیہ خاندان کے واحد زندہ چشم وچراغ۔ شاعرِ بے مثال' پورا شہر انہیں جانتا ہے۔"

"اچھا اچھا' کیا گزری ہے اس کے ساتھ؟"

اس پر استاد بلما نے اسے فون پر ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔ پانچ کروڑ کا سن کر خود تھانے دار بھی اچھل پڑا تھا "کیا کہا؟ تمہارے دوست کے عوض پانچ کروڑ روپے مانگے گئے ہیں' یعنی تمہارا دوست اتنا دولت مند آدمی ہے؟"

"ارے نہیں صاحب! وہ بے چارے تو اتنے غریب ہیں کہ انہیں غریب کہنا بھی غربت کی توہین ہے" استاد بلما نے بتایا "ان کے پاس تو کھانے کے بھی پیسے نہیں ہوتے۔"

"تو کیا فون کرنے والا پاگل ہوگیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ' تمہارے دوست کا حلیہ کیا ہے؟ کہیں دیکھنے میں دولت مند تو نہیں معلوم ہوتا؟"

"ارے نہیں صاحب۔ استاد تو سو فقیروں کے ایک فقیر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے تو میں شہزادہ گلفام ہوں۔"

"تو پھر کیا سوچ کر ان بے وقوفوں نے تمہارے دوست کو اغوا کیا ہے؟"

"یہ میں کیا بتا سکتا ہوں' میں تو خود پریشان ہوکر آپ کے پاس دوڑا چلا آیا ہوں۔ کیونکہ ان لوگوں کا پھر فون آنے والا ہے۔"

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

تھانے دار گہری نگاہوں سے استاد بلما کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ اسے ایک سیدھے انسان محسوس ہو رہے تھے اور اس کا تجربہ یہ بتا رہا تھا کہ کم از کم استاد بلما جھوٹ نہیں بول رہے ہیں' یہ اور بات ہے کہ ان کے دوست کے حوالے سے کسی نے ان کے ساتھ مذاق کیا ہو لیکن یہ اپنی جگہ بالکل درست تھے۔

"چلو ٹھیک ہے" تھانے دار نے اپنی گردن ہلائی "میں تمہارے ساتھ چل کر دیکھتا ہوں' کس کا فون ہے اور وہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ اور یاد رکھو' اگر یہ مذاق ہوا تو ایک ایک کی کھال کھینچ لوں گا' سمجھے؟"

استاد بلما دل ہی دل میں وظیفے اور دعائیں پڑھتے ہوئے تھانے دار کو اپنی دکان پر لے آئے۔ وہ اس بات کی دعا کر رہے تھے کہ خدا کرے استاد محبوب اغوا ہی ہو گئے ہوں تاکہ ان کے سر سے تھانے دار کا بوجھ اتر جائے اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جس وقت دکان پہنچے اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون کرنے والے استاد محبوب ہی تھے۔

"منکہ شہزادۂ فخرِ مغل تاجدار نسل در نسل مخاطب ہوں" استاد نے کہا۔

"خدا کے لیے استاد' ہماری جان چھڑائیں" استاد بلما جلدی سے بولے "کیا ہوا ہے آپ کے ساتھ؟ کہاں ہیں آپ؟"

"میں شہپرِ افروں کارخانۂ قیدِ خونخوار گز شتم ہو رہا ہوں" استاد نے جواب دیا "اور تقاضائے بشریت عندالطلب مبلغ سات آٹھ کروڑ ہوں۔"

"دیکھا تھانے دار صاحب!" استاد بلما نے تھانے دار کو مخاطب کیا "میری بات صحیح نکلی نا۔ میرا دوست قید میں ہے۔"

"میں شاید الجھن نا گرفتہ ہوں" استاد نے کہا "تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔ اب میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ میرے ساتھ کیا گزری گزرانی ہے اور کیا تاوان ہے۔"

"اپنے دوست سے معلوم کرو کہ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا ہے" تھانے دار نے بلما کے کان میں سرگوشی کی۔ استاد بلما نے استاد محبوب سے دریافت کیا "استاد۔ ذرا اپنی زبان میں اغوا کرنے والوں کے حلیے تو بتا دو۔ فکر مت کرو' تمہاری بات میری سمجھ میں آجائے گی۔"

"ان میں سے ایک بہت منحوس صورت خفقانِ دل پذیر اکثیرو تاثیرِ بے پیر ہے۔ اس کے چہرے پر داغ داغ اجالا وشبِ گر قسم ہے۔ مردکِ نا آشنا روتھیا رو بیمارِ عندلیب زار و ہزار اور لاچار ہے۔"

استاد بلما نے فوراً تھانے دار کو ترجمہ کر کے بتا دیا "میرا دوست یہ کہہ رہا ہے کہ ان میں سے ایک بہت منحوس اور خونخوار شکل کا ہے۔ اس کے پورے چہرے پر چیچک کے نشانات ہیں اور اس کا رنگ بالکل سیاہ ہے۔"

"اوہ!" تھانے دار یہ سن کر بری طرح مضطرب ہو گیا "وہ تو بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ کئی لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کر چکا ہے۔ ہم لوگ تو بہت دنوں سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اب اپنے دوست سے یہ معلوم کرو کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا دوست جب بتانا شروع کرے تو وہ لوگ بھی سمجھ لیں۔"

"آپ بے فکر رہیں تھانے دار صاحب!" استاد بلما سینہ ٹھونک کر بولے "میرے دوست کی گفتگو ان کے فرشتوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئے گی۔ یہ تو میرا ہی دل گردہ ہے کہ میں سمجھ لیتا ہوں" پھر انہوں نے ریسیور میں استاد محبوب سے کہا "استاد۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"کیوں نہیں۔ میں عرض ابلاد امکانِ خارج سے اگلے موڑ کے مینارِ دو آتشہ وہنگامۂ بے طرب کی گزرگاہِ اولیں کا شکار زرد رنگ کا مکان فوق البشر ہوں۔ جس کے شمالاً جنوباً آہوئے چشم و نازنین یا حرم سبزی پیاز کے سودے کرتی ہیں اور شربت روح افزائش ہیں کہ جگر سوختہ دکان ڈاکٹراں ہے سامنے اس کے اور اب شمال وجنوب ہوائے سردِ مہراہ بے آب وزنجیر پا ہے۔ سترہ کروڑ نولاکھ کے حسنِ بہاراں نگاراں سلامت ہے۔ دو آنکھوں کے درمیان۔"

استاد بلما اس طرف تو تھانے دار کے ساتھ موجود تھے اور دوسری طرف استاد محبوب نرالے عالم کچھ زیادہ ہی بوکھلا بوکھلا کر جناتی زبان میں اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں اچانک ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ انہیں شہزادہ سمجھ کر اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے انہیں کروڑوں کی آسامی سمجھ رہے ہیں اور استاد کو یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ انہوں نے خود اپنی سیدھی باتوں سے ان لوگوں کو یہی تاثر دیا ہے کہ ان کے پاس سترہ کروڑ نولاکھ روپے موجود ہیں۔

حالانکہ باس نے ان کا دل بہلانے کے لیے اپنی محبوبۂ دلنواز کو بھی ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا لیکن اب کہاں کی تفریح' کہاں کا جوش۔ استاد کے تو توتے اڑ گئے تھے۔ ایسے میں استاد بلما سے گفتگو ان کے لیے بہت تقویت کا سبب بن گئی تھی۔ استاد چونکہ راستے بھر کے مناظر دیکھتے آئے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

تھے۔ انہیں یہ اچھی طرح یاد تھا کہ ان کو اغوا کرنے والے کن کن راستوں سے انہیں لے کر آئے ہیں اس لیے انہوں نے استاد بلما کو پوری تفصیل سے آگاہ کردیا تھا۔

جبکہ باس اور اس کے ساتھیوں کا یہ حال تھا کہ ان کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ استاد کس زبان میں گفتگو کررہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے ایسی زبان زندگی میں پہلی بار سنی تھی۔

"یہ شہزادہ کون سی زبان بول رہا ہے؟" باس کی محبوبۂ دلنواز نے حیران ہوکر دریافت کیا۔

"پتا نہیں" باس نے بے بسی سے جواب دیا "ایسی انوکھی زبان صرف شہزادے ہی بول سکتے ہیں۔"

اتنی دیر میں استاد اپنے دوست استاد بلما کو پوری تفصیل سے سب کچھ بتاکر فارغ ہوچکے تھے۔ اب ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا اور وہ بڑے بھدّے انداز سے مسکرا بھی رہے تھے اور ان کی دھندلائی ہوئی آنکھیں محبوبۂ دلنواز کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"شہزادے صاحب!" اس نے دریافت کیا "آپ نے وہ پیسوں کی بات کرلی؟"

"اتنی دیر سے میں اور کیا گفتگو ملائی سے نبرد آزما تھا" استاد نے غصے سے جواب دیا "سب ہوگیا ہے۔ اب ضرورت ستم رسید ہونے والا ہے۔"

"جی بہت بہت شکریہ!" باس نے ممنونیت سے اپنی گردن جھکادی "بس کچھ دیر اور..... لیکن یہ رقم کب تک مل جائے گی؟"

"مداخلتِ کنج نفس کے فوراً بعد" استاد نے جواب دیا۔

"شاید یہ کہہ رہے ہیں کہ کچھ دیر کے بعد پیسے مل جائیں گے" محبوبۂ دلنواز نے اپنے طور پر استاد کے بیان کی تشریح کی۔

محبوبۂ دلنواز نے فوراً استاد کی خاطر کے لیے گرما گرم چائے بناکر ان کے سامنے رکھ دی۔ اس وقت وہ سب کے سب استاد کے سامنے بچھے جارہے تھے۔ جبکہ استاد ہر فکر سے بے نیاز ہوکر محبوبۂ دلنواز کو قربان ہوجانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ایسا حسن پہلے نہیں دیکھا تھا یا شاید کوئی ان کے اس طرح قریب نہیں آیا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اس لڑکی کے لیے ایک عدد غزل کہہ لی تھی۔

"لڑکی!" انہوں نے محبوبۂ دلنواز کو مخاطب کیا "میں نے تمہارے لیے ایک غزلِ نامبارک کی جسدِ خاکی ابتدا کی ہے۔"

لڑکی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ استاد نے اس کے لیے کوئی غزل کہی ہے "جی شہزادے صاحب!" وہ مسکرادی "ضرور سنائیں اپنی غزل!"

"تو ہرمزنی اندوخدن، سینہ زنی طعنہ زنی نعرہ زنی بہ ہنگام شب صبح سحروشام ہے۔ لڑکی تو کہاں ہے۔ آفات بریدہ، حالات کشیدہ، بے چیدہ، ستم رسیدہ، لڑکی تو کہاں ہے۔ موجہ گل اندام، ہنگام آرام، ولدالحرام، لڑکی تو کہاں ہے؟"

ایسی دلدوز غزل ان کی سمجھ میں کیا خاک آتی۔ جب خود استاد کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن وہ ایک شہزادے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسلسل تعریف کرتے رہے تھے اور ان کی اس تعریف کا سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب پولیس نے ان پر دھاوا بول دیا۔ استاد بلما بھی پولیس والوں کے ساتھ تھے۔ پولیس استاد محبوب کی بتائی ہوئی ڈائریکشن پر بڑی آسانی سے اس کوٹھی تک پہنچ گئی تھی۔ تھانے دار نے خود استاد محبوب کو بھی مشکوک سمجھ کر لائن میں کھڑا کردیا تھا لیکن جب استاد بلما نے... یہ بتایا کہ یہی وہ نابغہ روزگار استاد محبوب نرالے عالم ہیں کہ جن کی وجہ سے آج یہ گروہ پکڑا گیا ہے تو وہ بھی حیرت سے استاد کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ گرفتار ہوگئے ہیں" باس نے کہا "لیکن میں اپنی ایک الجھن دور کرنا چاہتا ہوں اور وہ الجھن یہ ہے کہ اگر یہ کوئی شہزادہ وغیرہ نہیں ہے تو پھر یہ سترہ کروڑ نولاکھ روپے کہاں سے آگئے اس کے پاس؟"

اس پر استاد نے مسکراتے ہوئے اپنی شاعری کا حساب کتاب اس کے سامنے رکھ دیا۔ یعنی ان کے نزدیک ان کا ہر شعر دس ہزار کا تھا۔ اس طرح انہوں نے اب تک جتنی بھی شاعری کی تھی۔ وہ کل ملاکر سترہ کروڑ نولاکھ کی ہوئی تھی۔ اس حساب کتاب کو سن کر باس باقاعدہ اپنا سر پیٹنے لگا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ان دونوں آدمیوں پر برس پڑا جو استاد کو اغوا کرکے لائے تھے "میں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ تم لوگ کسی فالتو بندے کو پکڑلائے ہو۔"

اس کی یہ بات استاد نے بھی سن لی اور وہ پوری طاقت سے برس پڑے "ناہنجار۔ زہرہ و مریخ کا ماموں۔ کج ادا، نالائق پیر ستم و شہر آشوب۔ مجھے فالتو کہتا ہے، یعنی استاد محبوب کو۔ مغلیہ خاندان کے آخری چشم وچراغ تیرے سامنے پیر فلک رسید ہوگیا ہے اور تو ہے...."

ان کی یہ باتیں سن کر تھانے دار ہنس پڑا۔ پولیس والے ہنس پڑے اور انتہا یہ تھی کہ خود باس اور اس کے ساتھی بھی ہنس رہے تھے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استادنامہ

منظر امام

زبانِ اردو کو جدید الفاظ اور ترکیبات سے نوازنے کا سہرا استاد کے سر باندھا جا سکتا ہے... اپنے ہی انداز کی خاص شخصیت ہونے کے ساتھ وہ جدید اردو زبان کے بانی ہیں... جو نہ سمجھے اسے خدا کوئی... نئے سال کے آغاز پہ استاد کے قدردانوں اور مداحوں کے لیے خاص تحفۂ عقیدت...

نیکی اور بدی کے راستوں کی ہمواری اور ناہمواری کا پتا دیتی مختصر نویسی......

بہت دنوں سے استاد کی طرف جانا نہیں ہوا تھا۔ میں استاد کی خیریت معلوم کرنے جب ان کے محل میں پہنچا تو وہاں ایک عجیب صورتِ حال تھی۔

یاد رہے کہ استاد اپنی جھونپڑی کو محل کہا کرتے تھے۔ تو استاد کے محل میں عجیب طرح کے لوگ بھی تھے۔ عورتیں، مرد، گندے سے بچے۔ جس طرح کے بھکاری ہوا کرتے ہیں۔

استاد ان کے سامنے ایک تخت پر بیٹھے تھے۔ استاد مجھے دیکھ کر چہک اٹھے۔ ”تم بالکل وقتِ فیض یاب میں آگئے ہو۔ اب ان سیر چشموں اور کج کلاہوں کو میرے افتخارِ بے جا سے گنجے شانگاہ کرو۔ یہ مرلی دھرن میری زبان مبارک کو آثارِ بے مہابہ سمجھ کر اہرامِ مصر ہوئے جا رہے ہیں۔“

مطلب یہ تھا کہ میں بالکل ٹھیک وقت پر استاد کے پاس پہنچا ہوں۔ استاد یہ چاہتے تھے کہ میں ان کی گفتگو کو آسان کر کے ان لوگوں کو سمجھاؤں۔

www.pakistanipoint.com

''وہ تو ٹھیک ہے استاد۔ میں ان لوگوں کو سمجھا دوں گا لیکن آپ ان کو کہاں سے پکڑ لائے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ سب سیر چشمی فلک امروز ہو رہے تھے۔'' استاد نے بتایا۔ ''گلی کوچے میں سنگِ آرزوؤں کی طرح موسمِ فراقِ فغاں تھے۔ میں اپنی کج کلاہی اور سلطان آشنائی کے لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔''

اچانک ان میں سے ایک بوڑھے نے مجھے مخاطب کیا۔ ''بھائی جان! تم کچھ سمجھ دار لگتے ہو۔ اس بڈھے سے پوچھو کہ یہ ہمیں یہاں کیوں لے آیا ہے؟''

''لیکن تم لوگ ہو کون؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بابو صاحب! ہم منگتے لوگ ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''بھیک مانگنے کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہیں۔''

''یہ تو سمجھ گیا لیکن تم سب جمع ہو کر یہاں کیوں آ گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بابو! یہ پتا نہیں کیوں ہم سب کو یہاں لے آیا ہے اور اس کی کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ یہ بولتا کیا ہے۔ زبان کون سی ہے اس کی؟''

''زبان تو خیر اردو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ویسے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ تم لوگوں کو کیوں لائے ہیں۔''

''ہاں بابو اس سے بات کرو۔ ہم سب تو کھانے پینے کے لالچ میں چلے آئے تھے۔ یہاں آ کے پتا نہیں کیا کیا سننا پڑ رہا ہے۔''

''استاد یہ سب کیا ہے۔ کیوں لائے ہیں ان سبھوں کو؟''

''مرغانِ غلا یا کرنے کے لیے۔'' استاد نے بتایا۔ ''آمادۂ سنگِ یشب سے فرقان و خفقان کرنے کے لیے۔ تاکہ سایۂ ابرِ پاکیزہ ان کو مقلاق ہو جائے۔''

''خدا کے لیے استاد کچھ رحم کرو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری ایسی گفتگو سے تو میں بے موت مر جاتا ہوں۔ یہ تو پھر بھی دوسری قسم کے سادہ لوگ ہیں۔''

''اب ان سے فرماؤں وا ستادہ ہو جاؤ کہ یہ دغائے بے خطر میں ہیں۔ سفر میں ہیں۔۔۔ اور حضر میں ہیں۔ کوئی کفرانِ نعمت ان کو دستِ طلب دراز کرنے سے افسردہ و رنجور نہیں کر سکتا۔ محافظ قانون اور جنون ان کے ہمراہ ہیں۔''

مطلب یہ تھا کہ استاد نے ایک طرح سے ان بھکاریوں کو پروٹیکشن دے دی تھی کہ وہ بے دھڑک بھیک مانگتے رہیں۔ کوئی ان کو منع نہیں کرے گا۔ کیونکہ قانون کے محافظ ان کے ساتھ ہیں۔

''استاد! یہ آپ نے کون سا کام سنبھال لیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ نے ان بھکاریوں کا ٹھیکا کیوں لے لیا؟''

''میں ان کے لیے فرستادۂ شب خون ہوں۔ چشمِ گریہ ناک سے الم ناک ہو گیا ہوں۔''

استاد کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان بھکاریوں کے لیے بہت سنجیدہ ہیں اور ان کے غم میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ اسی دوران میں پولیس کا ایک سب انسپکٹر جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر بھکاریوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔

''سنجان بنو۔'' استاد نے ڈانٹ کر کہا۔ ''وجہ بے گانگ کا کوئی وطیرہ دوا اور یا قفا نہیں ہے۔ یہ معاونت سیرِ طلب کے لیے حاضر محلات میں فروکش ہوئے ہیں۔''

اس پولیس والے کو میں بھی بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''رفیق صاحب! یہ سب کیا چکر ہے، کیا ہو رہا ہے یہاں؟''

پھر اس پولیس والے نے جو کچھ بتایا۔ اس نے مجھے چکرا کر رکھ دیا، اس کا کہنا تھا۔ ''صاحب! آپ خود دیکھتے ہیں۔ رمضان کے ہوتے ہی سیکڑوں بھکاری اس شہر پر یلغار کر دیتے ہیں۔''

''ہاں، وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں لیکن اس کا استاد سے کیا تعلق؟''

''استاد سے تعلق یہ ہے کہ استاد نے ان بھکاریوں کا ٹھیکا لے لیا ہے، بلکہ ٹھیکا لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''بھائی رفیق کھل کر بتاؤ۔''

پھر پتا چلا کہ استاد نے یہ سازش کی تھی کہ پولیس والے ان بھکاریوں سے ہر شام کو پیسے چھین لیا کریں گے۔ اس کے لیے استاد نے رفیق کو ٹھیکا دیا تھا پھر جب یہ بھکاری پولیس والوں کے ہاتھوں تنگ ہو جائیں گے تو استاد ان کو اپنی امان میں لے لیں گے۔ امان میں لینے کے بعد اس علاقے کے پولیس والے ان کو تنگ نہیں کریں گے۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ یہ بھکاری ہر شام اپنی دن بھر کی کمائی استاد کے پاس جمع کرا دیں گے۔ اور عید سے دو تین دن پہلے پیسوں کا حساب لگا کر پچھتر فیصد ان بھکاریوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ بقیہ پچیس فیصد میں رفیق اور اس کے ساتھی پولیس والے شامل ہوں گے۔ تھوڑا سا حصہ استاد کو بھی مل

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جائے گا۔

''یہ تو بہت بے تکی بات ہے رفیق صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بھکاری استاد پر بھروسا کیوں کرنے لگے؟''

''ہمارے ڈر سے۔'' رفیق ہنس دیا۔ ''اب مجھے استاد کے پاس دیکھ کر ان کو یقین آگیا ہوگا کہ استاد اور پولیس والے ملے ہوئے ہیں۔''

''بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ بھکاری پولیس کے ہاتھوں تنگ ہو رہے ہیں تو کسی اور علاقے کی طرف نکل جائیں۔''

''آپ کو یہی بات تو نہیں معلوم۔'' رفیق نے کہا۔ ''اب شہر میں جگہ کہاں ہے، ہر جگہ کی بکنگ فل ہو چکی ہے۔ دو دو مہینے پہلے سے بکنگ کرانی پڑتی ہے۔''

''اور اس بکنگ میں کون کون شامل ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس والے اور ان کے ٹھیکے دار۔'' رفیق نے بتایا۔

''لیکن استاد کیوں ان کا درد لے کر بیٹھ گئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''استاد کا یہ کہنا ہے کہ وہ بھکاریوں کے درمیان مساوات چاہتے ہیں۔ انصاف چاہتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ اس طرح کے ہر بھکاری اپنے اپنی جگہ محنت کرتا ہے۔ دن بھر بھیک مانگتا ہے لیکن کسی کو بہت کم بھیک ملتی ہے۔ کسی کو بہت زیادہ مل جاتی ہے۔ اسی لیے استاد چاہتے ہیں کہ ان سبھوں کی کمائی اکٹھی کر کے ان میں برابر برابر تقسیم کردی جائے۔ تاکہ سب ہنسی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔''

''خدا جانے یہ سب کیا چکر ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''استاد کو یہ کیا سوجھ گئی ہے لیکن ان بھکاریوں کو کون سمجھائے گا؟''

''ان کو میں سمجھاؤں گا۔'' رفیق نے بتایا۔ ''اسی لیے تو آیا ہوں۔''

استاد ابھی تک بھکاریوں سے اپنی جناتی زبان میں الجھے ہوئے تھے۔ میں اس وقت صرف تماشا دیکھ رہا تھا۔

رفیق نے ان بھکاریوں کو مخاطب کیا۔ ''اوئے، میری بات سنو۔ یہ جو استاد تم لوگوں کو یہاں لے کر آئے ہیں، یہ تمہاری بھلائی کے لیے لائے ہیں۔ یہ بہت نیک اور پرہیزگار انسان ہیں۔ یہ تم بھکاریوں کو اپنی حفاظت میں رکھنا چاہتے ہیں۔ تم ان کی حفاظت میں آگئے تو پھر کوئی پولیس والا شام کے وقت تمہاری کمائی نہیں چھین سکے گا۔''

''ہاں جی، ہم تو بہت تنگ آچکے ہیں۔'' ایک بوڑھے بھکاری نے کہا۔ ''تین چار دنوں میں تم لوگوں نے ہماری ساری کمائی چھین لی ہے۔''

''اسی لیے استاد نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم ان کی پناہ میں آگئے تو پھر کوئی پولیس والا تمہیں تنگ نہیں کر سکے گا۔ خود دیکھ لو میں استاد کے پاس آیا ہوں۔ استاد کے ساتھ ملا ہوا ہوں۔''

''ارے بھائی تو ہم کس طرح ان کی پناہ میں آئیں؟''

''تم سب اپنے دن بھر کی کمائی استاد صاحب کے پاس جمع کرا دیا کرو۔'' رفیق نے بتایا۔ ''یہ پوری ایمان داری کے ساتھ رجسٹر میں تمہاری دن بھر کی کمائی لکھتے جائیں گے۔''

''واہ، یہ کیا بات ہوئی..... اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو؟''

''پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ کمشنر صاحب کا آرڈر ہے کہ اس علاقے میں بھکاریوں کو داخل نہ ہونے دو۔ پھر تم لوگوں کو یہاں سے بھگا دیا جائے گا۔''

''یہ تو ظلم ہے، ناانصافی ہے۔ اب تو ہمیں دوسری جگہ بھی نہیں ملے گی، پورا شہر بک ہو چکا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ استاد صاحب کی پناہ میں آجاؤ۔''

''اگر خود تمہارے استاد نے ہمیں دھوکا دے دیا تو؟'' ایک بھکاری نے پوچھا۔

استاد اس کی بات سن کر بھڑک اٹھے۔ ''سخن تاب تشنۂ آب۔ بلبلِ خودساختہ، فراغِ بے جا، مجھ فرازِ ماہ کو سیارگان افتاد سمجھتا ہے۔ ناشاد سمجھتا ہے۔ میں زنجبار ہوں۔ موسلا دھار ہوں۔ میں سڑک فنی ہوں۔ روز رندانہ ہوں۔ پیمانہ ہوں۔ میخانہ ہوں۔''

''ایک تو یہ جو کہہ رہے ہیں، وہ میری سمجھ سے باہر ہے۔'' ایک نوجوان بھکاری منہ بنا کر بولا۔ ''اردو تو یہ بولتے ہی نہیں ہیں۔''

''یہ اردو ہی ہے۔'' رفیق نے کہا۔ ''استاد صاحب کو تمہاری بات سن کر بہت افسوس ہو رہا ہے۔ وہ ناراض ہو رہے ہیں کہ اس جیسے فرشتہ انسان پر شک کیا جا رہا ہے۔''

''حوالدار صاحب۔'' ایک جوان بھکارن نے رفیق

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کو مخاطب کیا۔'' وہ تو سب ٹھیک ہے۔ پھر بھی ہم لوگوں کو کوئی جمانت تو چاہیے نا، ہم اتنی دور سے دکھ اٹھا کر آئے ہیں۔ ٹھیکے دار کو پیسے دیے ہیں۔ دن بھر محنت کرتے ہیں۔ پھر اپنی محنت کی کمائی کسی اور کے حوالے کیسے کر دیں؟''

''ہاں، ہاں یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سارے بھکاریوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

استاد پھر بھڑک اٹھے۔ ''بدلحاظ، بدقماش، تم شوریدہ ہو، آب دیدہ ہو، رنگ ساز ہو۔''

''دیکھو استاد صاحب۔'' ایک بھکاری اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تمہارے فارسی بولنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہم لوگوں کو پوری گارنٹی چاہیے کہ تم ہمارے پیسے لے کر نہیں بھاگو گے۔''

''اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔'' رفیق نے کہا۔ ''میں پولیس والا ہوں۔ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ ایک ذمے دار آفیسر ہوں میں۔ پورا علاقہ استاد صاحب کو جانتا ہے۔ تم بدبخت لوگ ہو کہ ایک بندہ تمہاری بھلائی کا سوچ رہا ہے اور تم اس پر شک کر رہے ہو۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر ہم آپس میں فیصلہ کر لیں۔'' ایک نے کہا۔

''چلو، آپس میں بات کر لو۔''

سارے بھکاری ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ میں استاد پر برس پڑا۔ ''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں اپنی رہی سہی عزت خاک میں ملا رہے ہیں۔''

''میں ثوابِ دارین و بحرین حاصلِ بے مہار کر رہا ہوں۔'' استاد نے کہا۔

''اس میں کس قسم کا ثواب ہے۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو یہ سارے بھکاری آپ کی زندگی عذاب کر دیں گے۔''

''شہیدانِ راہ وفا کے ساتھ سلوک گلفام و بیرام تو ہوتا ہی ہے۔'' استاد لاپروائی سے بولے۔ ''دیکھنا یہ ہے کہ گنج شانگاں کہاں ہے۔ استغفراللہ۔ بغداد و قسطنطنیہ کہاں ہے۔ خط اسود سے بحر مروارید کا کیا فاصلہ ہے؟''

''بس آپ اپنی بکواس کرتے رہیں۔'' مجھے بھی استاد کے بے تکے پن پر غصہ آ گیا تھا۔ ''جب یہ لوگ آپ کی جان کو آ جائیں اس وقت مجھے کچھ نہیں کہیے گا۔ میں نے آپ کو سمجھا دیا ہے۔''

''تمہیں یار پورن ماشی کو چشمک فرہاد و مجنوں سے کیا لینا دینا۔'' استاد نے کہا۔ ''تم یہ اندازۂ پیراں کر لو کہ میں ان کے درمیان بول بالائے انصاف وادتان کر کے رہوں گا، چاہے خود گنجلک اور سال خوردہ ہو جاؤں۔''

مقصد یہ تھا کہ وہ ان بے چاروں کے درمیان انصاف کر کے رہیں گے۔ چاہے خود ان کا جو بھی حال ہو۔ اور لوگ انہیں کچھ بھی کہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے بھکاریوں کی بھلائی کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔

وہ سب آپس میں الجھے رہے۔ اور میں ان سبھوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر ان کے محل سے باہر آ گیا۔ دو چار دنوں کے بعد اسی رفیق سے پتا چلا کہ ان بھکاریوں کا استاد سے معاہدہ ہو گیا ہے۔ وہ سب اس انتظام سے بہت خوش ہیں تو میں استاد کے پاس پہنچ گیا۔

''استاد! آپ نے یہ کیا لگا رکھا ہے؟ کیوں اپنی زندگی کو عذاب میں ڈال رہے ہیں۔''

''میں طبقاتِ مظلوماں کا چراغ پا اور میستری کار ہوں۔'' استاد نے کہا۔ ''میں ان کی بہتری کا برازیل اور ملک شام اور دمشق ہو گیا ہوں۔ یہ سب ترسیدہ اور خوابیدہ ہیں۔ میں انہیں رنجیدۂ دل گیر نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان کے لیے بساطِ خوں آشام بنوں گا۔ گلفام بنوں گا۔''

''گلفام بننے کے چکر میں کہیں مارے نہ جائیں۔''

''ایسا وحشت امکان نہیں ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''یہ سب صحرائے بے خودی ہی کے ہینگ ٹھیکے دار ہیں۔ قید حیات و رنج و غم ہو رہے ہیں۔ یہ سر بریدہ اور آسماں کبیدہ لوگ ہیں۔ مسافرت شب ہائے حاتم طائی کر کے یہاں امید وصال و انتقال پر آئے ہیں۔''

اس لمبی چوڑی بات کا مطلب یہ تھا کہ یہ سب بے چارے اتنی دور سے کمائی کے لیے آئے ہیں۔ یہ مظلوم اور بے چارے قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا ضرور ساتھ دینا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔

''آپ کی مرضی ہے استاد۔''

''اب ایک فرمانِ بے حجاب سن لو۔'' استاد نے کہا۔ ''میں کوئی بے وقوفانِ رستم و افراسیاب نہیں ہوں۔ اور نہ ہی سبیل بے مہار و گرسنگ ہوں بلکہ جو بھی کر رہا ہوں، وہ بحیرۂ احمر اور دانش ور ہے۔''

''اب میں کیا کہوں، آپ جس کو اپنی عقل مندی سمجھ رہے ہیں۔ وہ آپ کے گلے بھی پڑ سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ میری ان باتوں کا استاد پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جو بات ان کے ذہن میں آ جائے، اس کو نکالنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

جو سوچ لیا وہ سوچ لیا۔ اسی لیے میں بک بک کر کے واپس آ گیا۔

چار پانچ دنوں کے بعد افطار سے فارغ ہو کر پھر ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھے۔ مجھے دیکھ کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''فروغ افطار کو درستار تو کر ہی لیا ہوگا۔'' استاد نے پوچھا۔

''ہاں استاد، میں افطار کر کے ہی آیا ہوں۔''

''تو بس اب چکیدن باغ باغ ہو جاؤ۔'' استاد نے کہا۔

''میں تمہیں دیدار رنگ و بو سے قارون کر رہا ہوں۔''

پتا نہیں اس بات سے استاد کا کیا مطلب تھا۔

استاد ایک کونے سے ٹین کا ایک بکس اٹھا کر لے آئے۔ ''بہ چشم خود ملاحظہ و پرداختہ کرلو۔'' استاد نے اس بکس کو کھولتے ہوئے کہا۔

میری تو آنکھیں ہی پھٹی رہ گئی تھیں۔

وہ بکس نوٹوں اور سکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک روپے کے نوٹ۔ آٹھ آنے۔ چار آنے۔ (اس زمانے میں اسی قسم کی کرنسی چلا کرتی تھی) میرے اندازے کے مطابق اس بکس میں کم از کم چار پانچ ہزار تو ضرور ہوں گے۔

''استاد! اتنے پیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔ یہ سب کارگیہ بھکاراں ہے۔'' استاد نے بتایا۔

''سب کے سب بحرِ قلزم سے آبنوس زماں ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اندازہ دخترِ مشرق ہو گئے ہیں۔ شمالاً جنوباً پرواز کاسہ گدائی اور سودائی ہیں۔ حوران پری رو ہیں۔''

مختصر یہ کہ استاد یہ بتا رہے تھے کہ یہ سارے روپے بھکاریوں نے جمع کیے ہیں اور وہ پابندی سے ہر شام کو اپنی کمائی استاد کے حوالے کر جاتے ہیں۔

''استاد! یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن آپ پر بہت بڑی ذمے داری آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، اب میں سنگلاخ بے زمین ہو گیا ہوں۔'' استاد نے کہا۔

میں استاد کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

رمضان کا مہینا بھی ختم ہونے والا تھا اور میری مصروفیات ایسی ہو گئیں کہ مجھے استاد کی طرف عید کے بعد جانا ہوا تھا اور جب وہاں پہنچا تو صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔

استاد کی جھونپڑی (جس کو وہ محل کہا کرتے تھے) زمیں بوس ہو چکی تھی۔ لگتا تھا توڑ پھوڑ کی گئی ہو۔ وہاں محلے کے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ میں نے ان سے صورتِ حال معلوم کی تو ان میں سے ایک نے کہا۔ ''کیا آپ کو نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے؟''

''نہیں بھائی، مجھے نہیں معلوم۔''

''یہ جو استاد تھے۔ انہوں نے بھکاریوں کا پتا نہیں کیا گولی پلا دی تھی۔ بہت سے بھکاری ان کے پاس اپنے پیسے رکھواتے تھے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر یہ ہوا کہ استاد بھکاریوں کی ساری رقم لے کر بھاگ گئے۔''

''بھاگ گئے؟''

''ہاں بھائی بھاگ گئے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ جو جھونپڑی کا حال دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہی بھکاریوں نے کیا ہے۔ بڑی توڑ پھوڑ مچائی ہے سب نے، پولیس والے بھی استاد کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔''

''اوہ خدا، اب وہ بھکاری کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کہاں ہوں گے۔ سب کے سب روتے دھوتے استاد کی جان کو گالیاں دیتے ہوئے اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے۔ بے چارے عید کی کمائی کرنے آئے تھے۔ لیکن لٹ لٹا کر واپس چلے گئے۔''

میں یہ سب سن کر حیران ہوا جا رہا تھا۔

استاد سے ایسی امید تو نہیں رہی تھی۔ کچھ بھی ہو۔ وہ بے ایمان نہیں تھے۔ محنت کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ لیکن اب کیا ہوا کہ بھکاریوں کے پیسے ہی لے کر بھاگ گئے۔ پتا نہیں کیا چکر تھا۔

لیکن جاتے کہاں، استاد کو تو اسی شہر میں رہنا تھا۔ ملاقات تو ہونی تھی۔ اور ایک دن ان سے ملاقات ہو بھی گئی۔ استاد خود ہی میرے پاس میرے گھر تشریف لے آئے تھے۔

میں انہیں دیکھ کر بھڑک اٹھا۔ ''استاد! آپ نے یہ کیسی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ آپ جیسے آدمی سے ایسی امید تو نہیں تھی۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے آپ نے۔''

استاد بے شرمی سے مسکراتے رہے۔

میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''جواب دیں۔ یہ کیسی حرکت کی ہے آپ نے؟''

''میں عندلیبِ ثواب جاریہ دمار یا ہوں۔'' استاد نے کہا۔ ''اطمینانِ قلب نا مپور ہوں۔ افتاں و حیراں ہوں کہ زردی مائل سرخ و سفید ہو گیا ہوں۔''

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

"ایسی بے تکی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔" میں اور بھی بھنا گیا۔ "اگر آپ نے نہیں بتایا تو میں خود آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"کیا تم مجھے فتاوی عالم گیری سمجھتے ہو۔ منتر اک سمجھتے ہو۔ نم ناک سمجھتے ہو۔" استاد کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ "میں تمہیں بحیرۂ کوہستان سے آشنائی دل پذیر کراتا ہوں۔ ماہیِ بے آب کا سمندر رہوں۔ ارجمند کوتا ہوں آؤ میرے ساتھ۔"

میں بھی جھلا کر ان کے ساتھ ہولیا۔ اب وہ چاہے جہاں بھی لے جا رہے ہوں۔

استاد مجھے ایک ایسی بستی میں لے آئے جہاں بہت خستہ سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ادھوری دیواریں، بوسیدہ چھتیں، بستی پر ایک اداسی چھائی ہوئی تھی۔

استاد نے ایک دروازے پر دستک دی۔ یہ دروازہ بھی خستہ لکڑی کا تھا۔ دروازہ کھلا اور ایک عورت نے باہر جھانکا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس سے زیادہ ہی ہو گی۔ لیکن مفلسی کے باوجود اس کے چہرے سے اس کی اشرافت اور اس کے خاندانی پس منظر کا اظہار ہو رہا تھا۔

وہ عورت استاد کو دیکھ کر چہک اٹھی تھی۔ "آئیں جناب آئیں اندر آ جائیں۔"

استاد نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم اس گھر کے آنگن میں آ گئے۔ یہ ایک روایتی سا مکان تھا۔ ایک طرف ایک درخت، آنگن میں ایک تخت بچھا ہوا جس کے اردگرد پرانی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

"لڑکیاں آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں آپ کئی دنوں سے نہیں آئے۔" اس عورت نے کہا۔

"انتظام خوش حال کن تو ماورائے امکان ہے نا۔" استاد نے اس سے پوچھا۔

وہ عورت جز بز ہو کر رہ گئی۔

استاد نے پھر پوچھا۔ "سمند افگن تو ہو رہا ہے نا؟"

"آپ مجھے بتائیں۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے اس عورت سے پوچھا۔ "استاد سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

"میرا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اب یہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں۔" اس عورت نے کہا۔ "خدا نے ان کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر کہاں سے بھیج دیا ہے۔"

"بات کیا ہوئی؟ کیا کر دیا استاد نے؟"

پھر اس عورت نے بتایا کہ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ تینوں کے رشتے لگ گئے تھے لیکن انہیں رخصت کرنے کے لیے اس عورت کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے استاد آ گئے اور انہوں نے اتنے پیسے دے دیے ہیں کہ سادگی سے سہی لیکن تینوں بیٹیاں اپنے گھروں کی ہو سکتی ہیں۔

ایک لمحے میں، میں سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ استاد نے ان بھکاریوں کے پیسے اس مجبور عورت کو لا کر دے دیے تھے اور خود پر دھوکے دہی کا اتنا بڑا الزام لے لیا تھا۔

میں نے استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "استاد! آپ نے وہی پیسے ان کو دیے ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" استاد مسکرا دیے۔ "کیونکہ میرے پاس اور کوئی ذریعہ ستم گراں نہیں تھا۔ ان پیشہ ور لوگوں کے پیسے اگر کسی شریف اور مجبور خاندان کے کام آ جائیں تو اس میں کیا سیر چشمی ہے اصل حق دار فطرہ وزکوٰۃ اسی قسم کے مقہور اور رنجور لوگ ہوتے ہیں۔"

استاد نے یہ فرمایا تھا کہ وہ بھکاری پیشہ ور قسم کے دھوکے باز لوگ ہوتے ہیں۔ فطرہ وخیرات کے اصل حق دار اس قسم کے مجبور لوگ ہوتے ہیں۔ جو کسی کے آگے اپنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتے۔

استاد نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے ایک بار اس عورت کو دیکھا تھا۔ پھر اس عورت کے محلے کے ایک آدمی نے استاد کو اس عورت کی مجبوریاں بتائیں۔

استاد نے اسی وقت اس کی مدد کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن کس طرح۔ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر انہوں نے پیشہ ور بھکاریوں کو لوٹنے کی پوری پلاننگ تیار کی۔ اس پولیس والے کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور بھکاریوں کی ساری کمائی لا کر اس مجبور عورت کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اب مجھے بدنامی چاہ را درویش سے کوئی خاگینہ نہیں ہے۔" استاد نے کہا۔

مطلب یہ تھا کہ اس کی مدد کرنے کے بعد استاد کو بدنامی وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔

"استاد آپ ایک بہت بڑے آدمی ہیں۔" فرط جذبات سے میری آواز کانپ رہی تھی۔

اور استاد بولے جا رہے تھے۔ "ارے، میں تو آب گینہ ہوں۔ سفینہ ہوں۔ دفینہ ہوں۔ ریگ بے چناب ہوں۔ خفقان ہوں۔ بادیان ہوں۔ زنجبار ہوں۔" وغیرہ وغیرہ۔

اب وہ چاہے کچھ بھی بولتے رہیں، وہ انسان بہت بڑے تھے۔ ان سے بھی بڑے جن کی زبان تو سمجھ میں آ جاتی ہے لیکن دل سمجھ میں نہیں آتے۔

☺

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استاد شاگرد

منظر امام

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

استاد شاگرد کا رشتہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم و دائم رہے گا... استادوں کے لیے ذہین و قابل شاگرد تفاخر کا باعث بنتے ہیں... مگر اس دفعہ ناقابلِ فہم و جناتی زبان کے موجد استاد گرامی کے مقابل انہی کا ایک ہم پلہ و ہم منصب تھا...

لبوں پر مسکراہٹیں اور قدم قدم پر پھلجڑیاں بکھیر دینے والا شگفتہ سلسلہ

استاد کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔

شاید استاد کو زندگی میں پہلی بار اپنی ٹکر کا کوئی بندہ ملا تھا جوان کی زبان میں ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے استاد کے گھٹنے پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ ''یا لائقان حضور، ظہیرانہ چشمِ گریہ سے کام نہ لیں۔ واضحہ اجلات وسیم تن کر لیں۔''

''کیا فربۂ کشتہ بہ زورِ انکمنی کر رہا ہے۔'' استاد نے اپنے گھٹنوں سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''فرمانروائی نہ فرمائیں۔ ہم ویسے کشتگانِ عزیزانِ مصروشام ہیں۔'' وہ نوجوان بلکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیوں ہمیں داغ دواغ کجانسہنگ آور کررہے ہیں۔ سوفتنی کو سنبھالا دیں۔ مرد کی نیم عصیاں کو جائیں۔''

استاد کی توسٹی گم ہونے لگی۔ انہوں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مردود مرد کو، نامدارِ بے جا کشتگانِ طفلِ آوارہ فرمودات ثقلان بے حجازی مت کر۔ واضح اکسیر چشم ہوجا۔''

جس وقت ان دونوں کی یہ تاریخی گفتگو ہورہی تھی، میں ان کے قریب ہی موجود تھا اور ہنس ہنس کر میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ استاد کو بھی کیا بندہ ٹکرایا تھا۔ اس کی جناتی زبان نے خود استاد کے بھی چھکے چھڑا دیے تھے۔

پہلے پہل تو میں یہ سمجھا تھا کہ وہ استاد کو بے وقوف بنانے کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے استاد جیسی زبان بول رہا ہے اور اس کے لیے اس نے نہ جانے کتنی پریکٹس کی ہوگی۔

لیکن وہ متواتر بولتا ہی رہا تو مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ناٹک نہیں کررہا بلکہ اتفاق سے ایک دوسرا استاد پیدا ہوگیا ہے جو استاد کی طرح بوڑھا اور بدشکل نہیں ہے بلکہ جوان اور خوبصورت ہے۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں سراپائے خاکِ اقلیدس ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''آہوان سرائے خاندان گم گردوں نے مجھے کامران کے نام سے مہمیز ودل آویز کیا ہے۔''

مطلب یہ کہ اس کا نام کامران ہے۔

اس اثنا میں استاد بول پڑے۔ ''اے خلفِ راہگیر سے دردمولی افتادگاہ تو کرو کہ بسبب ملاقات معلوم اور مفہوم ہوجائے۔''

استاد کا مطلب یہ تھا کہ میں اس سے دریافت تو کروں کہ وہ استاد کے پاس کیوں آیا تھا۔

''ہاں بھئی۔ تم استاد کے پاس کیوں آئے ہو۔ کیا کام ہے ان سے؟''

''دلشاد غنچۂ نوترساں کرنا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''فراغ ماہی سے بزرگوارم کا سوختہ ساتھ لے جاکر فصلیں کج کلامی کرنا ہے تاکہ آموختہ کو قرار دستکار آجائے۔''

''استاد، یہ تو تم سے بھی دو ہاتھ آگے کی چیز ہے۔'' میں نے استاد سے کہا۔

''ناہنجار کی طفلانِ بے تیر اور شمشیرِ بے کم بخت۔''

استاد نے برا سا منہ بنا کر اس کے لیے تبصرہ کیا۔

اس دوران ایک مہذب اور معقول سا آدمی وہاں آگیا تھا۔ اس نے اس نوجوان کی گردن پکڑ لی۔ ''بدبخت تو یہاں کیا کررہا ہے جا گھر جا۔''

''جناب یہ کون ہے؟'' میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

''یہ نالائق میرا چھوٹا بھائی ہے، جناب، اس سے تنگ آچکا ہوں میں۔''

''اس کو ہوا کیا ہے؟ یہ کیسی زبان بولتا ہے؟''

''پورا گھر اسی زبان کی وجہ سے پریشان ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ شروع ہی سے ایسا ہے۔''

''تو اس کی بات آپ لوگ کیسے سمجھ لیتے ہیں۔''

''یہ کبھی کبھی سیدھی زبان بھی بولتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تو پھر پتا چل جاتا ہے کہ یہ کیا کہنا چاہتا ہے۔''

''اس سے وجۂ گرفتارِ عندلیب تو پوچھو۔'' استاد میری طرف دیکھ کر دہاڑے۔

''ہاں یہ بتائیں کہ یہ استاد کے پاس کیوں آیا ہے؟''

''یہ استاد کو اپنا روحانی باپ مانتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور استاد کو اپنے رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔''

یہ ایک نئی کہانی سامنے آئی تھی۔ اس نوجوان نے ہاتھ ہلا ہلا کر استاد سے زیادہ جناتی انداز میں عربا اور فارسا کا ملغوبہ اگلنا شروع کردیا اور میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔

سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ استاد کی تقلید کو باعثِ عزت سمجھتا ہے۔ اور ادھر استاد کا یہ حال تھا کہ ان کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ایسا شاندار حریف ملا تھا ان کو کہ جس نے ان کی زبان بند کردی تھی۔

وہ شخص اپنے چھوٹے بھائی کو کسی نہ کسی طرح سمجھا کر وہاں سے لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی استاد بہت دیر تک بھن بھناتے رہے۔ ''یہ کیسی درفتنی ہے، سوختنی ہے، وہ مرد کیا مردود زیرہ ہوتا جارہا تھا۔''

''استاد۔ آپ کچھ بھی کہتے رہیں، آپ کو اپنی ٹکر کا مل ہی گیا۔''

استاد نے اس پر خود مجھے دس باتیں سناڈالیں۔ ان کی ناراضی دیکھنے کے قابل تھی۔ ویسے اب مجھے خود اس نوجوان میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ استاد کی بات اور تھی۔ وہ چاہے کچھ بھی بولتے رہیں، انہیں کون پوچھنے والا تھا لیکن اس نوجوان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

پھر اس کا استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھنا اور یہ خواہش کرنا کہ استاد اس کے رشتے کی بات کرنے جائیں.... یہ سب بہت عجیب تھا.... بہر حال ایک دلچسپ صورت حال تھی۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ نوجوان رہتا کہاں ہے لیکن یہ مرحلہ اس طرح طے ہوگیا کہ محلے کے ایک نوجوان نے مجھے اس کا پتا بتا دیا۔

میں دوسرے دن اس نوجوان سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اچھا خاصا مکان تھا۔ اس کے بھائی نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ مجھے پہچان کر اندر بیٹھک میں لے آیا۔ ''تشریف رکھیں جناب۔ شاید آپ کامران کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔''

''جی جناب۔ اس نے مجھے حیران کر دیا کیونکہ میں اس طرح کے ایک بندے کو بھگت ہی رہا تھا۔ اب یہ دوسرا بھی سامنے آ گیا۔''

''ہم لوگ تو پریشان ہو کر رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کون سی زبان بولتا رہتا ہے۔''

''اس کی یہ کیفیت کب سے ہے؟''

''بہت دنوں سے۔'' اس نے بتایا۔ ''بی اے کے بعد ہی اس نے ایسی جناتی زبان بولنی شروع کر دی تھی۔''

''تو پھر آپ لوگوں نے کیا سمجھا؟''

''ہم لوگوں کا خیال تھا کہ شاید یہ پاگل ہو گیا ہے لیکن اس میں پاگلوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہے بس اس کی جناتی زبان نے تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے سوا اس سے اور کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''اور یہ استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھنا، یہ کیا چکر ہے؟''

''وہ ایک بار استاد کو دیکھ آیا تھا۔ اس نے آپ کے استاد کی باتیں سنیں۔ بس وہیں سے گرویدہ ہو گیا اور ان کو اپنا روحانی باپ سمجھنے لگا۔''

''اور یہ شادی کا کیا قصہ ہے؟ وہ استاد کو کہاں بھیجنا چاہتا ہے؟''

''ہاں یہ بھی ایک کہانی ہے۔ ایک لڑکی ہے۔ شمشاد نام ہے اس کا، اچھی لڑکی ہے۔ اچھا خاصا گھرانا ہے، کھاتے پیتے لوگ ہیں کہیں ان دونوں کی ملاقات ہوئی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ اپنے بڑے کو لے کر آؤ اور یہ کم بخت روحانی باپ کے طور پر آپ کے استاد کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔''

''کیا ان لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ اس قسم کی جناتی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

زبان بولتا ہے۔''
''ہاں وہ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود شادی کرنا چاہتے ہیں۔''
''یہ تو بہت حیرت کی بات ہے۔ اب بتائیں اب کیا ہوگا؟''
''اپنے استاد سے کہیں کہ وہ اس نامعقول کے لیے چلے جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ شاید یہ مکمل پاگل ہوجائے گا۔''
''چلیں اس میں کیا حرج ہے۔ میں استاد کو راضی کر لوں گا۔ ویسے آپ کی شادی ہوچکی ہے؟''
''نہیں میں ابھی زندگی بنانے کی کوشش کررہا ہوں۔''
وہ آدمی بہت ہی معقول دکھائی دیا تھا جب کہ اس کا چھوٹا بھائی عجیب وغریب چیز تھا جس میں نہ جانے کس طرح استاد کی روح حلول کرگئی تھی۔
میں نے واپس آکر استاد کو ساری سچویشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''استاد آپ اس کے رشتے کی بات کرنے چلے جائیں۔''
''میں آبگینہ نہیں ہوں۔'' استاد جھلا کر بولے۔ ''اس مرد بسیارِ خور نے مجھے گردشِ لیل ونہار سمجھ رکھا ہے۔ میں ایسا قلزم نہیں ہونے دوں گا۔''
''استاد اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بندہ ناٹک نہیں کررہا بلکہ وہ آپ ہی کے اسٹائل میں بات کرتا ہے۔ میں نے اس کے گھر والوں اور محلے والوں سے بھی تصدیق کرلی ہے۔''
''کمال ہے۔ ورنہ اس طرزِ شیفتہ کا موجد غم ناک اور وحشت ناک تو صرف میں ہوں۔''
یعنی استاد کو اس بات پر حیرت تھی کہ آخر وہ اس طرح کیوں بولنے لگا ہے جب کہ یہ زبان تو ان ہی کی ایجاد کردہ تھی۔
''استاد اسی لیے تو وہ آپ کو اپنا روحانی باپ سمجھتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس حوالے سے آپ کو رشتے کی بات کرنے کے لیے بھیجنا چاہ رہا ہے۔ اس میں تو آپ ہی کی عزت ہے کہ آپ اس کے بزرگ بن کر لڑکی کے گھر جائیں گے۔ آپ کی آؤ بھگت ہوگی۔''
''ٹھیک ہے، میں تیار باشد ہوں لیکن اس دراز قد کو بھی ہمراہِ رقیباں ہونا ہوگا۔''
وہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استاد چلنے کو تیار تھے لیکن وہ اس نوجوان کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

وہ نوجوان اگلی شام پھر استاد کے پاس آگیا۔ میں نے استاد کی رضامندی اس کے بڑے بھائی تک پہنچا دی تھی۔ اسی لیے وہ شاید استاد کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔
''اے عزوجاہ میں خشم گیر ہوں۔'' اس نے استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔
''میں بری ذاتش تہمت غسن ومملوک عصیاں ہوں۔'' استاد نے فرمایا۔
''میں عزیزش جفر سنگ ہوں۔''
''اور میں درستائش خوان عفت ہوں۔'' یہ استاد نے کہا۔
استاد اس وقت پورے جاہ وجلال میں تھے اور نہ جانے کہاں کہاں سے الفاظ لا رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان اس پاگل پن کا جیسے مقابلہ شروع ہوگیا تھا اور میرا یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہونے لگا لیکن ان دونوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ دونوں ہی اپنی جناتی زبان میں لگے ہوئے تھے۔
بالآخر اس نوجوان نے کہا۔ ''من شکریہ آنم کہ من دانم ہوں۔ آپ کو جانب لیلی چمن زار دعوت فرقان دینے آیا ہوں۔ آپ حدود اوقات مرتب زینہ فرمالیں تو بندہ سواری معکوس وافلاطوس لے کر حاضر ہوجائے گا۔''
یعنی وہ استاد کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ان سے یہ درخواست کررہا تھا کہ استاد یہ بتادیں کہ کس دن اور کس وقت جانا ہے تاکہ وہ سواری لے کر حاضر ہوجائے۔
استاد نے دوسری شام کا وقت دے دیا پھر استاد نے میری طرف دیکھا۔ ''تم بھی تو پابہ رکاب دجال ہوگے۔'' یعنی تم بھی تو ساتھ چلوگے نا۔
ظاہر ہے میں کس طرح انکار کرسکتا تھا ایک تو خود استاد کی ذات گرامی اور پھر سونے پر سہاگا وہ نوجوان.... لڑکی والوں کے گھر پر جو تماشا ہونے والا تھا، وہ سوچ سوچ کر ہنسی آرہی تھی۔
بہرحال دوسری شام ہم بات طے کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس وقت استاد بازی لے گئے تھے۔ انہوں نے کیا زبردست تیاری کی تھی کہ کچھ نہ پوچھیں۔ گلے میں ایک ہار، کمخواب کی شیروانی زیب تن کی تھی۔ ایک ٹیکسی میں استاد، وہ نوجوان، میں اور اس نوجوان کا معقول بھائی بیٹھے تھے جس کا نام لقمان تھا۔ دوسری ٹیکسی میں ڈھول تاشے والے تھے۔
ہم لڑکی کے گھر سے کچھ فاصلے پر اُتر گئے۔ مکان اچھا

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

خاصا معقول قسم کا تھا اور ظاہر ہے کہ اس میں رہنے والے بھی معقول ہی ہوں گے مگر وہ اس نامعقول سے اپنی بیٹی کا رشتہ کرنے جا رہے تھے۔

استاد نے ڈھول تاشے والوں کو حکم دیا اور انہوں نے پورا محلہ سر پر اٹھا لیا۔ محلے کے لوگ گھروں سے نکل نکل کر دیکھنے لگے۔ میں اس وقت بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

میرا خیال ہے کہ رشتے کی بات کرنے کے لیے کوئی کبھی اس انداز سے نہیں آیا ہوگا جس انداز سے ہم لوگ آئے تھے۔

لڑکی والوں کی ہمت اور صبر کی داد دینی پڑی۔ انہوں نے اس طرح کی آمد کا برا نہیں مانا بلکہ بہت خوش اخلاقی سے ہمارا استقبال کیا۔

ہم سب کو ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جو گفتگو شروع ہوئی وہ ایسی وحشت ناک اور انوکھی تھی کہ میں کئی بار ہنس ہنس کر گر گیا۔

سب سے پہلے اس نوجوان نے کہا تھا۔ ”منکہ طرابلس کوہ کن و فرہاد بجان ہو کر حاضرِ غلمان ہوا ہوں۔“

اس پر استاد نے تڑکا لگایا۔ ”شنیدہ و چکیدہ دارائے فرخ خلل غم بودیے۔“

پھر نوجوان نے کہا۔ ”میں کہ خسروانِ شہروز شادی افروز ہونے آیا ہوں۔“

پھر استاد نے کہا۔ ”یہ میرا اپسر خوں بہا چوپان و چوگان را کے نکوست مالا بار ہے اور میں دریوزہ گرفتنہ تاریخِ ابتلا ہوں۔“

پھر لڑکے نے کہا۔ ”اور بہتر یہی ہے کہ مال و اسباب بہرام و افراسیاب کی داستان امیر حمزہ ہو جائے۔“

آپ خود غور فرمائیں اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ انتہا یہ ہے کہ خود لڑکی والے بھی پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنسنے جا رہے تھے۔

استاد کو ایک دم سے جلال آ گیا۔ انہوں نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”نالائق دل پذیر، تو مال و اسباب بہرام اور افراسیاب کی کیا ملوکیت کہہ رہا ہے۔“

آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ اشارہ یہ تھا کہ جہیز میں کیا کیا چیزیں ملیں گی اور بس یہیں سے استاد کو جلال آ گیا انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ”تم اس دوشیزہ نادان کے گھر والوں کو سمجھا دو کہ جو نوجوان ابھی سے طفیانِ افلاطون اور ستم بریدہ شاخ آہو ہو رہا ہے وہ آئندہ کیا پارسانِ ابتلا دکھائے گا۔“

مطلب یہ کہ لڑکی والوں کو یہ سمجھا دوں کہ جو لڑکا ابھی سے مال و اسباب پر نظر رکھ رہا ہے وہ آگے چل کر کیا ثابت ہوگا۔

میں نے جب آسان زبان میں لڑکی والوں کو یہ بتایا تو اس لڑکے کا وہ بھائی جو اس وقت میرے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے لڑکے کا گریبان تھام لیا۔ ”نالائق کیا تم اس لالچ سے اس گھر میں شادی کر رہے ہو۔ لعنت ہو تم پر میں نہیں جانتا تھا کہ تمہارے دل میں یہ فتنہ چھپا ہوا ہے۔“

اب تو استاد کو ایک طرح کی شہ مل گئی۔ انہوں نے اس لڑکے کو بری طرح ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ”فتنہ برانگیز، ابلیس نابکار، قربان رسید، چکیدی محشر، تو کس قماش بے بہا کا ستم گراں ہے۔ تو پوشیدہ ہے، رنجیدہ ہے، آب دیدہ ہے۔ تو نے اپنی فطرت ظاہر عیاں کر دی ہے۔ تو شمشیرِ موج ہے۔ ہمشیرِ بے زبان ہے اور تقدیرِ بے تکان ہے۔ اس بچی کی شادی آبادی ہرگز تجھ جیسے افلاطوس سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تو تیرے بھائی ہیں شریف النفس اور نصف النہار ملک التجار داشند آمد بکار مناسب رہے گا۔“

استاد نے بیٹھے بیٹھے یہ ایک نئی لائن دے دی تھی کہ اس لڑکی کے لیے اس لڑکے کا بھائی مناسب رہے گا۔

اب لڑکی والے اس کے بھائی کو ایک نئے انداز سے دیکھنے لگے۔ یہ سچویشن ایسی تھی کہ خود اس کا بھائی ہکا بکا رہ گیا۔ استاد نے اسے مخاطب کیا۔ ”کیا تم مرضی تاب وتب سے روح فراز کر کے بتاؤ کہ یہ رشتہ بے مہاراں قبول ہے یا نہیں۔“

اس پر اس کے بھائی نے گردن ہلا دی اور دھیرے سے بولا۔ ”آپ فرماتے ہیں اور لڑکی کے گھر والے میرے لیے راضی ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اتنا سننا تھا کہ اس لڑکے کی سٹی گم ہو گئی وہ ذرا سی دیر میں اپنی جناتی زبان بھول گیا۔ ”ارے بھائی صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کیسے شادی کر لیں گے۔ رشتہ تو میں لے کر آیا ہوں۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ لڑکی کے باپ نے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کی شادی تم جیسے لالچی آدمی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ہاں تمہارے بھائی معقول آدمی ہیں ہم ان کے لیے فیصلہ کر سکتے ہیں۔“

یہ لیں استاد نے وہاں پہنچ کر بازی ہی الٹ دی تھی۔ اس نوجوان کے چھکے چھڑوا دیے تھے۔ بعد میں اس کے بھائی سے اس لڑکی کی شادی ہو گئی اور وہ نوجوان صاف اردو میں اپنے بھائی کو اور استاد کو برا بھلا کہتا ہوا محلے میں گھومتا رہتا ہے۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

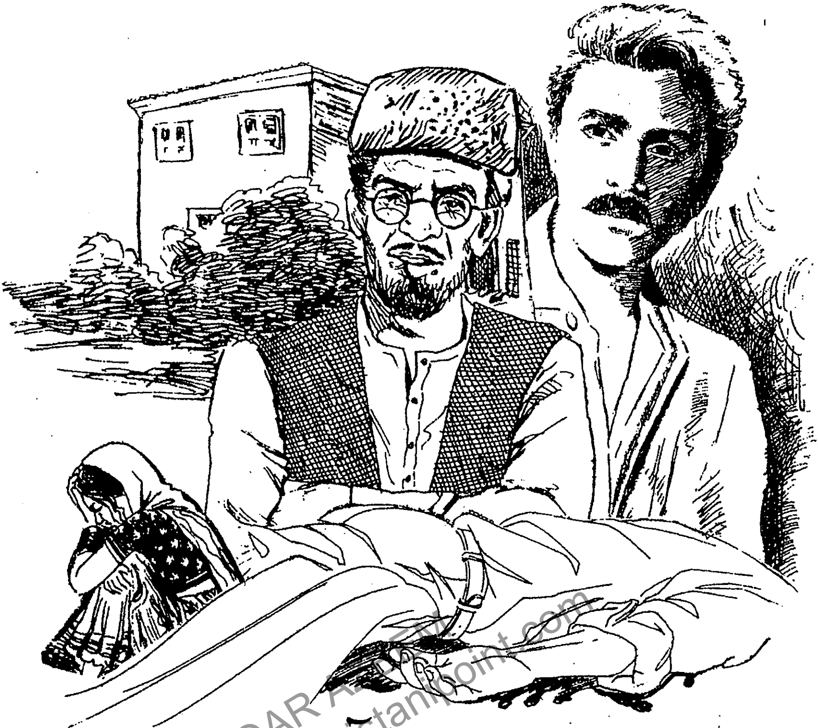

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

فقیرانہ آئے

منظر امام

کسی نیکی کو چھوٹا سمجھنا چاہیے اور نہ ہی نیکی کا کوئی موقع گنوانا چاہیے... وقت خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو... استادِ محترم کبھی بھی التفات... عنایت اور نیکی کرنے کا موقع ضائع نہیں کرتے... اس مرتبہ ان کی نظرِ خاص ایک فقیر عورت پر مرکوز ہو چکی تھی... نیکی سے جڑے ایک جرم کا دلچسپ ماجرا...

مشکل محاوروں اور ثقیل جملوں سے سجی تحریر کی حسن آرائی......

اُستاد میرے پاس ایک بہت ہولناک خبر لے کر آ گئے تھے۔

اس خبر کی ہولناکی کا اندازہ ان کی حالت سے ہو رہا تھا۔ وہ پورے بدن سے کانپ رہے تھے اور چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ آتے ہی انہوں نے پانی طلب کیا اور چار پانچ گلاس پانی پی گئے۔

''خیر تو ہے اُستاد؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے آپ کو؟''

اس پر استاد نے مجھ پر اور اپنے آپ پر کرم فرماتے ہوئے بتایا۔ ''میں اجل رسیدہ بھکاری و گداگر ہو گیا ہوں۔ خونِ تازہ کی نمو میرے ہاتھوں میں دست خود دہان خود ہے۔فرمائش قتل کر دیا ہے کسی کا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں استاد۔ آپ نے کس کا قتل کر دیا ہے؟''

''ہاں۔'' استاد اور بھی کانپنے لگے۔''یہ حرکتِ نادیدہ و چکیدہ سرزد ہوگئی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد۔ یہ معاملہ سیریس لگ رہا ہے۔ آپ بتاؤ آپ نے کس کا خون کر دیا؟''

اس پر استاد نے ایک لمبی چوڑی تقریر کے بعد انکشاف کیا کہ ان کے ہاتھوں ایک بھکاری کا قتل ہو گیا تھا اور اس کی لاش جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ہے۔

یہ سُن کر میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ استاد جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ان کی حالت یہ ظاہر کر رہی تھی کہ انہوں نے واقعی کسی کا خون کر دیا ہے۔

''استاد۔ یہ ...... یہ سب کیسے ہو گیا؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہاں، میں اب داستانِ صحرا نورد و گرد باد ہونے والا ہوں۔تم میرے ساتھ براجمان ہو جاؤ سوئے تھانہ و کچہری کے کہ میں خود کو مثالی خاک تھانہ کر جاؤں۔''

مطلب یہ تھا کہ استاد کو اب اپنی زندگی کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو تھانے جا کر پولیس کے سامنے سرینڈر کرنے والے تھے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے استاد کو روکا۔ ''چلیں استاد، پہلے چل کر دیکھ لیں کہ واقعی ایسا کچھ ہوا ہے یا نہیں۔''

استاد اس طرح میرے ساتھ چل پڑے جیسے وہ بکرا جسے قربانی کے لیے لے جاتے ہیں۔ استاد نے جو مقام بتایا تھا، اس کا فاصلہ وہاں سے زیادہ نہیں تھا۔

ایک پتلی سی سڑک تھی جس کے کنارے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہ ایک کچی سڑک تھی۔ جو سیدھی بس اسٹاپ کی طرف جایا کرتی تھی۔

اور وہیں جھاڑیوں کے پاس ایک لاش تھی۔ جو دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اردگرد بہت سے لوگ تھے۔ کچھ پولیس والے تھے۔ استاد جوش کے عالم میں آگے بڑھنا چاہتے تھے لیکن میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا کر رہے ہیں استاد، رک جائیں۔''

''وہ آدمی واصل چرخ بالا میری وجہ سے ہوا ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''میں اس کو سلاجیت اور سلاطین نہیں کر سکتا۔''

اب پتا نہیں سلاجیت اور سلاطین سے کیا مراد تھی لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ استاد کو اپنے جرم کا مکمل احساس ہے اور وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔

صورتِ حال بہت تشویشناک تھی۔ استاد جیسے بے ضرر انسان نے کسی کا خون کر دیا تھا۔ جو ان کے مزاج اور ان کی فطرت کے بالکل خلاف تھا۔

یہ درست تھا کہ انہیں کبھی نہ کبھی خود کو پولیس کے حوالے کر دینا تھا لیکن اس سے پہلے میں استاد سے سارا ماجرا سننا چاہتا تھا تا کہ ان کے بچاؤ کا کوئی انتظام کیا جا سکے۔

میں استاد کو ان کے محل میں لے آیا تھا۔

''استاد! اب آپ دھیرے دھیرے بڑے سکون کے ساتھ یہ بتا دیں کہ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ آپ ایسے آدمی تو نہیں ہیں پھر اسے کیوں مار دیا؟''

استاد نے اپنے جناتی اسٹائل میں بتانا شروع کیا۔ ''میں کہ اس جانب سے روزانہ گزران گزرگاہ شیر فروش تھا کہ وہ ہاتھ پھیلائے دامنِ گیر و مجال ہو جاتا کہ ملبوس کون و مکاں کو کفن بردوش ہے اور پاپوش ہے جبکہ خرگوش ہے۔''

پتا نہیں استاد کیا بولے جا رہے تھے لیکن اتنا پتا چل گیا تھا کہ استاد جب بھی اس طرف سے گزرتے، وہ ان کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔

استاد کی باتیں سمجھنے کی تکنیک یہی تھی کہ بس خاموشی سے سنتے چلے جاؤ اور میں خاموشی سے سُن رہا تھا۔

''پھر ایک دن وہ گل بہ اندام پشیمان مرغزار ہو گیا۔ کہنے لگا کہ اگر میں بھی بھکاری ہو جاؤں تو خاطرِ احباب کو خزینہ بے بہا ہو جائے اور جبلت سیر طفیل سے عاری اور جاری ہو۔''

یعنی اس بھکاری نے استاد سے یہ کہا کہ وہ بھی اگر اس کے ساتھ بیٹھ کر بھیک مانگنا شروع کر دیں تو ان کی آمدنی دگنی ہو جائے اور کچھ دنوں میں حالات بدل جائیں۔

''میں کہ خانوادۂ چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر ہوں۔'' استاد جوش کے عالم میں بولے چلے جا رہے تھے۔ ''اور وہ فقیرانِ تند و بے حال ایسی خرافات دلپذیر اور دستگیر کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اے قلق، اے بلبل، سوختہ سامان ہو جا۔ تو نہیں جانتا کہ منکم آنم کہ خام دانم۔ میں غارت گر ہوش و ایمان ہوں۔ اور کوہ نور کا وارثِ بے سکون

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

ہوں۔ لال قلعہ میرے اجداد کی نشانی اور کہانی ہے کہ عالم جادوانی ہے اور زنجیر لافانی ہے۔"

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ استاد نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور وہ کم بخت انہیں بھیک مانگنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

"پھر کیا ہوا استاد؟"

"پھر داخلِ سوختہ و اینٹ بے مول ہوگیا کہ پائدار رسید تھا۔ میں نے قریباً بالخیر اہتمام کر کے اسے معروضِ بے بہار کر دیا اور وہ نوشتہ دیوار بے جان ہوگیا۔"

بہت دیر کے بعد سمجھ میں آیا کہ استاد کو اس بات پر اتنا غصہ آیا تھا کہ انہوں نے پاس پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور اس کا انتقال ہوگیا۔

بہت ہی خطرناک پوزیشن ہوگئی تھی استاد کی۔ ان کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہوگیا تھا۔ چاہے وہ بھکاری ہی کیوں نہ ہو اور اس نے کیسی ہی غلط بات کی ہو۔

ویسے یہ قتل ذہنی اشتعال کی وجہ سے ہوا تھا۔ جس کا افسوس استاد کو بھی ہو رہا تھا اور ان کا صاف اور معصوم ضمیر انہیں پولیس کے پاس جا کر اعتراف کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

واردات واقعی ہوگئی تھی۔ کیونکہ لاش میں خود دیکھ آیا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میں استاد کو مشورہ دینے لگا۔

"استاد! جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں۔ آپ کو کسی نے ایسی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ بس خدا سے معافی مانگتے رہیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔ کیونکہ آپ نے اسے جان بوجھ کر نہیں مارا۔"

میرا خیال ہے کہ اتنی دیر میں خود استاد کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا تھا اس لیے انہوں نے میرے مشورے پر ہی عمل کرنا مناسب سمجھا تھا۔

پولیس اس بھکاری کے قاتل کو تلاش کر رہی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ اس طرف استاد نے میری جان کھا رکھی تھی۔ "میں سپنے میں عندلیبِ خواب ہو رہا ہوں۔" ایک دن انہوں نے بتایا۔ "چراغ کینہ کی طرح وہ بھکاری بھوت خانہ بن کر تارِ عنکبوت ہو جاتا ہے اور فروغِ شام کو قاتلِ دستِ ہوس ہو جاتا ہے۔"

مقصد یہ تھا کہ وہ بھکاری خواب میں بھوت بن کر بابا کو پریشان کرنے لگا ہے۔

اب وہ بھکاری بھوت بن کر استاد کو پریشان کرتا ہو یا نہ کرتا ہو۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ استاد کی طرف سے پریشانی

سیاسی پارٹیاں

آپ ذرا تھوڑا سا ماضی میں جھانکیے کیا کیا نام سامنے آتے ہیں۔ ری پبلکن پارٹی، جناح عوامی لیگ، عوامی لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی، عوامی مسلم لیگ، جسٹس پارٹی، نظام اسلام پارٹی اور نہ جانے کیا کیا پارٹیاں تھیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر
یہ پارٹیاں اس طرح ٹوٹیں کہ کوئی ان کا نام لیوا تک نہ رہا حالانکہ ان میں سے بعض برسرِ اقتدار بھی رہیں۔ مگر دیکھیے، مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے۔ وہ جو غالب نے کہا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
چنانچہ پارٹیاں بنتی بھی رہیں اور ٹوٹتی بھی رہیں۔ پھر ان میں سے نئی نئی پارٹیاں جنم لیتی رہیں۔ مارشل لا کے دور میں کیا کیا پارٹیاں وجود میں آگئیں، کیسے کیسے حمایتی پیدا ہوئے، لیکن وقت کا دھارا سب کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اب وہی لوگ جمہوریت کے گن گا رہے ہیں، جمہوریت کی خوبیاں گنوا رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ مارشل لا والے بھی جمہوریت کے فوائد بیان کر رہے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری قوم کا حافظہ ہمیشہ سے کمزور چلا آرہا ہے۔ لاکھ روغن بادام ملو، چاہے جتنا خمیرہ گاؤزبان عنبرین کھلاؤ، کتنا ہی شربت انار پلاؤ، اس کی یادداشت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے۔ چلیے حساب صاف ہوگیا۔

معاف کیجیے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پارٹیاں ٹوٹی ہی نہیں بنی بھی ہیں۔ ایک ایک پارٹی سے کئی کئی بنی ہیں۔ اب مسلم لیگ ہی کو دیکھ لیجیے۔ کتنی لیگیں بن گئیں۔

اقتباس: سرخ، سفید، سیاہ از شفیع عقیل

WWW.pakistanipoint.com WAQAR AZEEM

لاحق ہوگئی تھی کہ وہ کہیں پولیس کے پاس نہ پہنچ جائیں۔

لیکن شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

ایک دن استاد نے میرے پاس آکر کہا۔ ''تم ذرا میرے ساتھ سمندِ ناز تو کرو۔'' یعنی میرے ساتھ چلو۔

''وہ کیوں استاد؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کہاں لے جارہے ہیں۔''

''ابتلائے گلے خانہ فرماں روائے مقامِ واردات قلبی کے پاس۔'' استاد نے فرمایا۔ ''میرا مشاہدہ دل گیر ہے کہ اس مرحوم و مغفور اور رنجور کی بیوی نفاست زیبا ہو رہی ہے۔''

''خدا کے لیے استاد۔ ایسے موقع پر تو اردو بول لیا کریں۔''

پھر بڑی مشکلوں سے استاد یہ سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ وہ مجھے اس جگہ لے جانا چاہتے تھے جہاں انہوں نے اس بھکاری کا خون کیا تھا۔ کیونکہ اس جگہ اب بھکاری کی بیوہ بیٹھا کرتی تھی۔ استاد اسے پہچانتے تھے اسی لیے استاد اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔

یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جس سے کوئی خطرہ ہوتا اسی لیے میں استاد کے ساتھ ہولیا۔

ٹھیک اسی جگہ اب ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ استاد نے اس کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھتے ہوئے کہا۔ ''دعائے رنجشِ مغفور کردینا۔''

''کیا بولا صاحب؟''

''امتزاج مرحوم کو ایصالِ بدخشاں کردینا۔'' استاد نے پہلے جملے سے بھی زیادہ مشکل بات کہہ دی۔

استاد مارے جوش کے اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے۔ اسی لیے میں استاد کو وہاں سے کھینچ لایا۔

اس دن کے بعد سے استاد کا وتیرہ ہوگیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے اس جگہ پہنچ جاتے اور اس عورت کو کچھ نہ کچھ دے آتے۔ اس عورت نے بھی استاد کو حاتم دوراں سمجھ لیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کے آنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔

ایک دن میں نے استاد سے پوچھا۔ ''استاد! آخر آپ کب تک اس کی مدد کرتے رہیں گے۔ اب چھوڑ دیں اس کو۔''

''یہی تو افشائے راز ہے۔'' استاد نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں کس طرح فقیہان اقتال وجدال سے چشم پوشی کرسکتا ہوں۔''

یعنی وہ کس طرح اس کی مدد کرنا چھوڑ سکتے تھے۔

ایک دن پھر استاد کو جوش چڑھا۔ اور وہ میرے پاس آگئے۔ ''بس اب بہت سیر چشمی ہوچکی۔'' انہوں نے کہا۔ ''میں بکار خاص ہونے جارہا ہوں۔''

''کیا مطلب استاد؟''

''میں ماجرائے دردِ دل اس عورت کے گوش گزار کردوں گا۔'' استاد نے فرمایا۔

میں نے بہت سمجھایا۔ لیکن استاد کی کوئی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ وہ یہ تو جان گئے تھے کہ وہ پولیس کے پاس نہیں جائیں گے۔ لیکن ان کا فیصلہ تھا کہ وہ اس عورت سے ضرور اپنے اس جرم کی معافی مانگ لیں گے۔

میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔

بہرحال ہم وہاں پہنچ گئے۔ وہ عورت اسی جگہ موجود تھی۔ استاد نے اس کو دیکھتے ہی بولنا شروع کردیا۔ ''اے دل گرفتہ، دست بریدہ۔ میں مجبور و مقہور لرزہ بہ اندام کو دشنل شرمندگان عالیہ ہوں کہ تو جو ہر حیات سے تقدیم و تاخیر ہوچکی ہے اور تیرا دردِ دل درد جگر بن کو مغز سر میں گوشہ نشین ہوگیا ہے۔''

استاد کی اس بے مثال تقریر نے اس بھکارن کو پریشان کردیا تھا۔ وہ حیران نگاہوں سے کبھی استاد کو دیکھتی کبھی مجھے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بابو صاحب، یہ پاگل آدمی کیا بول رہا ہے؟''

اس موقع پر میں نے اس بھکارن کی پریشانی دور کی۔ ''دیکھو، یہ صاحب پاگل نہیں ہیں۔ یہ بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ یہ تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے علم سے یہ معلوم کرلیا ہے کہ تم بیوہ ہوچکی ہو۔ تمہارا شوہر کسی حادثے میں مرچکا ہے۔''

''ہاں جی ہاں۔'' اس عورت نے جلدی سے گردن ہلادی۔ ''وہ مرگیا ہے جی، ہم بہت پریشان ہیں۔''

استاد نے فوراً اس کے ہاتھ پر دس کا نوٹ رکھ دیا۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں دس روپوں کی بہت اہمیت تھی آج کے پانچ سو سمجھ لیں۔

دس روپے پاتے ہی اس عورت کی دعاؤں کی مشین گن چل پڑی۔ اس نے استاد کے پورے خاندان کو دعائیں دے ڈالیں۔ استاد بہت ہی قلب مطمئنہ کے ساتھ وہاں سے واپس آئے تھے۔

اس دن کے بعد سے استاد نے اپنا یہ معمول بنالیا۔ وہ ادھر سے گزرتے ہوئے اس عورت کو دس کا ایک نوٹ دے دیتے اور اس کی دعائیں لے کر واپس آجاتے۔

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

ایک دن استاد نے میرے پاس آکر ایک روح فرسا انکشاف فرما دیا۔ ''میں اس عورت کو اسپغول عالمِ تاب کرنے جا رہا ہوں۔''

''کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''فرمانروائے مملکت شاہانِ عظمت و گرفتہ۔'' استاد نے بتایا۔

''میں اب بھی نہیں سمجھا۔''

اس بار استاد نے بڑی مشکلوں سے آسان کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ وہ اس عورت سے شادی کرنے جا رہے ہیں۔

''کیا؟ میں تو یہ سن کر پاگل ہو گیا۔'' کیا فرما رہے ہیں استاد! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟''

''بس یہی ایک رہ گزر جام و مینا اور سفینہ ہے۔'' استاد نے بتایا۔

مقصد یہ تھا کہ استاد نے اس عورت سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کا شوہر استاد ہی کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا۔

''خدا کے لیے ایسا مت کرنا استاد۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مغلیہ خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ ایک بھکارن ہے۔ آپ اس کی مدد کرتے رہیں۔ آپ کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔''

استاد نے پھر کچھ نہیں کہا۔

ایک صبح وہ تشریف لائے تو بہت بوکھلائے ہوئے تھے۔ ''وہ...... وہ فرستادہ براجمان گوشہ کنارہ ہو رہا ہے۔'' استاد نے بتایا۔ ''وہی جو ماوالنہر ہو گیا تھا اور خاکِ عالم سے بقائے دوام کو چلا گیا تھا۔''

استاد کی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ استاد نے اسی بھکاری کو اس عورت کے پاس دیکھ لیا تھا۔ جس کو وہ مار چکے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی استاد۔ وہ کوئی اور ہو گا۔''

''نہیں۔ میں اتنا بھی بے ہوش و گمان نہیں ہوں۔ چشم ساقی سے دیکھ کر تشریف فرما ہو رہا ہوں۔'' مطلب یہ تھا کہ وہ پاگل نہیں تھے اور خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ کر آ رہے تھے۔

صورتِ حال جاننے کے لیے خود وہاں پہنچ گیا۔ استاد قریب نہیں گئے تھے۔ وہ اس وقت سخت خوف زدہ ہو رہے تھے۔ وہ عورت چونکہ مجھے پہچاننے لگی تھی۔ اسی لیے وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ استاد نے جس کو مارا تھا۔ وہ بھی اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کون ہے تیرا؟'' میں نے عورت سے اس بھکاری کے بارے میں پوچھا۔

''یہ میرا بھائی ہے جی۔'' اس عورت نے بتایا۔

''تم یہاں پہلی بار آئے ہو؟'' میں نے اب اس آدمی سے پوچھا۔

''نہیں جناب، پہلے میں ہی یہاں کھڑا ہوتا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بندے سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اس ظالم نے میرے سر پر اینٹ مار دی۔ میں بے ہوش ہو کر گر گیا تھا۔ برادری والے اٹھا کر لے گئے تھے۔ پھر اپنے گاؤں چلا گیا۔ اور اب واپس آیا ہوں۔''

''تو تم مرے نہیں تھے۔'' میں کچھ حیرت اور کچھ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

''نہ جی۔ میرا بھائی کیوں مرنے لگا۔ ہاں اسی ٹیم اسی جگہ اپنی برادری کے ایک بندے کا خون ہو گیا تھا کسی نے اسے چھری مار دی تھی۔''

''اوہ خدا۔ میں نے ایک گہری سانس لی تو معاملہ کچھ یوں تھا۔ بے چارے استاد خود کو گنہگار اور مجرم سمجھتے رہے تھے جبکہ مرنے والا ہٹا کٹا سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''تم نے تو بتایا تھا کہ تمہارا شوہر کسی حادثے میں مر چکا ہے۔''

''ہاں جی، تو اس میں کون سا جھوٹ ہوا۔ وہ بے چارہ گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔''

اب ساری باتیں واضح ہو چکی تھیں۔

میں نے جب استاد کو یہ سب کچھ بتایا تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''یہ تو مقامِ تشکر و منجاب ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''بے مایۂ بے حساب ہے اور آفتابِ عالم تاب ہے۔''

''ہاں شکر کریں۔ آپ کی جان اور عزت دونوں بچ گئیں اور آپ بھی خوامخواہ اس عورت کو اتنے دنوں تک پیسے دیتے رہے۔''

''ہو سکتا ہے کہ یہی بہانہ میری نجات کا ہو گیا ہو۔''

استاد نے یہ جملہ انتہائی رواں اور شستہ اردو میں فرمایا۔ ''استاد آپ تو سیدھی زبان بھی بول لیتے ہیں۔''

''ہاں۔'' استاد مسکرا دیے۔ ''بس فرونۂ وار دافتخارِ مینا سے جب جنگ دریاب دہان تازہ تازہ نمودار واردات باغیچہ اور غالیچہ ہوتا ہے تو......''

استاد بولتے رہے اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

سفر نہ صرف نئی جگہوں کی دریافت کا موجب بنتا ہے ... بلکہ مختلف انسانوں کی فطرت ... اور نفسیات کے پہلوئوں پر بھی جامع روشنی پڑتی ہے ... استاد صاحب نے بھی اس دفعہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ سفر کریں گے ... اور ضرور کریں گے ...

استاد کی مخصوص و دلفریب زبان میں مزہ دوبالا کرتا دل پذیر قصۂ سفر نامہ

نامۂ سفر نامہ

منظر امام

یہ وہ زمانہ تھا جب استاد پر سفر نامہ لکھنے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مسکرا کر فرمایا۔ ”یہ بر بنائے داخلِ آدمیت سے رہزن ہے۔“

”اب اس کا ترجمہ بھی عنایت فرما دیں تو نوازش ہو گی۔“

”سفر بہ حاتمِ دوراں سے فلک خورشید مارکو پولو ہوتا ہے۔“ استاد نے کہا۔

”خدا کے لیے استاد کچھ آسان کریں ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ استاد نے آسان کرنے کے چکر میں ایک اور تقریر کر ڈالی جو پہلے والی سے کہیں زیادہ مشکل تھی۔ بہر حال خدا خدا کر کے یہ سمجھ میں آیا کہ سفر نامہ شہرت کا سبب بنتا ہے۔ اس سے رعب بھی پڑتا ہے کہ فلاں آدمی نے اتنے ملکوں کی سیر کی ہے۔

”یہ تو ٹھیک ہے استاد لیکن سفر نامے کے لیے سفر بھی شرط ہے اور آپ تو کبھی اپنے محلے سے باہر ہی نہیں گئے پھر سفر نامہ کس طرح کا لکھیں گے۔“

استاد معنی خیز انداز میں مسکرا دیئے۔ ”برخوردار چشمِ حیرت کو ایں جا بہ رسید کر کے داش آب و رنگ کر دیا ہے میں نے کیونکہ سفر خطر ہے۔“

www.pakistanipoint.com
AZEEM

"یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن سوال پھر وہی ہے۔"

"جامِ افراسیاب میں قلقلِ مینا کے پچھلے پانچ برسوں سے فروتنی کر رہا ہوں۔" استاد نے فرمایا۔ "ماحضر تناول کرتے کرتے یہ یک گوش و ہوش ہوتا جا رہا ہوں کہ دلیلِ فرصت کا مدار یہی ہے۔"

پتا نہیں اس دن استاد کس موڈ میں تھے کہ میری ہر بات کا جواب اسی انداز میں دے رہے تھے۔ بہر حال اندازہ ہو گیا کہ استاد سفر کے لیے پچھلے پانچ برسوں سے پیسے جمع کرتے پھر رہے ہیں۔

اس زمانے میں زندگی بہت آسان تھی۔ ویزے اور پاسپورٹ میں اتنی دشواریاں نہیں تھیں۔ مختلف قوموں کو ایک دوسرے پر اعتماد تھا اسی لیے بہ آسانی ویزے مل جاتے بلکہ بہت سے ممالک میں تو ویزوں کا بھی تکلف نہیں تھا۔ بس ائرپورٹ پہنچے اور انٹری مل گئی۔

"چلیں اب یہ بتا دیں کہ کہاں کے سفر کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چشم فلک نے انٹارکٹیکا سا آہو بدن جزیرۂ بے سامان نہیں دیکھا ہوگا۔" استاد نے فرمایا۔

"کیا ہو گیا ہے استاد آپ کو۔ انٹارکٹیکا ایک براعظم تھا جو ڈوب چکا ہے۔"

"اچھا......!" استاد نے حیرت ظاہر کی۔ "یہ ماجرائے دل پذیر پچھلے ہفتے تک تو رونما نہیں ہوا تھا۔"

"اس کو ہزاروں سال ہو چکے ہیں استاد پرابلم یہ ہے کہ آپ تک خبریں دیر سے پہنچتی ہیں۔"

استاد انٹارکٹیکا کے ڈوب جانے کی خبر پر بہت دیر تک اسی طرح خاموش رہے تھے جیسے ان کا پورا خاندان اسی پر ہو اور وہ سب ڈوب چکا ہو۔ بہر حال استاد نے کچھ دیر بعد ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر عقد ثانی افریقا ہے۔" مطلب یہ تھا کہ پھر دوسرا انتخاب افریقا ہے۔

"استاد آپ افریقا کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ وہ بستی دلیر و مردگاں ہے۔" استاد نے پُرجوش ہو کر کہا۔ "وہاں طاؤس درباب آخر ہوا کرتے ہیں۔ غزالان بے دھڑک سیر حاصل کرتے ہیں اور جنگل پکارتے ہیں، جانور آہیں بھرتے ہیں اور فطرت غریقِ سحاب و آفتاب ہو جاتی ہے۔" یعنی استاد کو فطری مناظر سے دلچسپی تھی۔ وہ جانوروں کو جنگل میں اچھل کود کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے افریقا کے سفر کا ارادہ کیا تھا۔

"استاد چلیں مان لیا کہ آپ افریقا پہنچ جائیں گے۔ وہاں کی سیر بھی کر لیں گے لیکن سفرنامے کا کیا ہوگا۔ کون سمجھے گا آپ کا سفرنامہ؟"

استاد ہنس پڑے۔ "میاں درزبان اردو برزبان ریختہ ہوگا۔" استاد نے فرمایا۔

"چلیں جناب، یہ بھی ہو گیا لیکن آپ اکیلے ہی سیر کریں گے؟"

"اکیلا کیوں...... تم بھی تو ہمراہ گوشہ بدست ہو گے۔" استاد نے فرمایا۔ "میں نے اندوختہ کو سوختہ کر رکھا ہے کیونکہ میں واقفِ آگہی ہوں کہ قرابت دارانِ سلسلۂ مفلساں ہو اور بدنیم درشت اطمینان ہو۔" اس بیان میں کام کی بات یہی تھی کہ بقول استاد کے انہوں نے میرے اخراجات بھی جمع کر لیے تھے کیونکہ میں ایک مفلس انسان تھا۔ اسی لیے استاد نے یہ کرم فرمائی کی تھی۔

"اب پروانۂ آمد و رفتِ خوباں کی سوچو۔" استاد نے کہا۔ "کل جمع رخصت اظہار کو سمند پاک کرنا ہے۔" مطلب یہ تھا کہ اب پاسپورٹ کی فکر کرو۔ کل صبح اس مقصد کے لیے روانہ ہونا ہے۔ استاد نے اس بار حیران ہی کر دیا تھا۔ وہ واقعی بہت سنجیدہ ہو رہے تھے۔ نہ جانے افریقا ان کے سر پر کیوں سوار ہو گیا تھا۔

بہر حال تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ہم دونوں کے پاسپورٹ تیار ہو گئے۔ استاد نے اس کے بعد سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کی تیاری بھی بہت عجیب و غریب سی۔

ایک عدد پاندان اور ایک چھ نال کی نقلی بندوق۔ میں نے جب اس کے بارے میں استاد سے دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔ "میاں سفر پُرخطر اور پُرحشر ہے۔ ہر قدم پر اسفنیہ یار اور اموات بے جا ہیں۔ دنیا بھر کے جانورِ نا تمام مثلِ مکمل گشت برافروز رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ بندوق لازم و ملزوم ہے۔"

"لیکن استاد یہ تو نقلی بندوق ہے؟"

"میاں جانوروں کو کیا معلوم کہ یہ نقلی ہے۔" استاد نے یہ جملہ آسان اردو میں ادا کیا تھا۔ میں استاد کی اس منطق کو سراہے بغیر نہیں رہ سکا۔

اس زمانے میں استاد نے نہ جانے کہاں سے تیس ہزار روپے جمع کر لیے تھے۔ آپ حیران نہ ہوں۔ اس

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

زمانے کے تیس ہزار بہت ہوا کرتے تھے۔ اتنے پیسوں میں پوری دنیا کی سیر ہو سکتی تھی۔

میں استاد کی باتوں کو اب تک مذاق ہی سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے پاسپورٹ بنوا لینے کے باوجود مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم واقعی افریقا کی سیر کو جا سکتے ہیں اور مقصد بھی کیا تھا ایک عدد سفرنامہ لکھنا۔ خود اندازہ کر لیں استاد کے سفرنامے کی کیا بات ہوتی۔

کئی دن گزر گئے۔ استاد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے ان کی تیاریاں کس مرحلے میں تھیں۔ بہرحال میں خود ہی استاد کے پاس پہنچ گیا۔ استاد اپنے محل میں تشریف نہیں رکھتے تھے۔ استاد نامہ پڑھنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ استاد محل کسے کہا کرتے تھے۔ ان کی جھونپڑی ان کے لیے محل تھی۔

بہرحال استاد اپنے محل میں نہیں تھے۔ ان کے محلے والوں سے پتا چلا کہ استاد پچھلے تین دن سے غائب ہیں۔

یہ ایک نئی بات تھی۔ ورنہ استاد مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جاتے تھے۔ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ ان کا کوئی دوسرا ٹھکانا بھی نہیں تھا جہاں سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتیں۔

مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ مختصر یہ کہ وہ ٹھیک ایک مہینے کے بعد دکھائی دیے تھے۔ اس دوران میرے سر سے افریقا کا بھوت مکمل طور پر اتر چکا تھا بلکہ استاد پر غصہ آ رہا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی استاد۔ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں عندلیبان سفر جاہ و حشم ہو گیا تھا۔'' استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا کہہ گئے ہیں لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔''

''اب تم ابتدائے سفرنامۂ محبوب عالم کا آغاز شروعات کرو۔'' استاد نے فرمایا۔

''کیا مطلب؟''

''میں سیر حاصل، دعا کامل ہو چکا ہوں۔''

''خدا کے لیے آسان کر کے بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا مصیبت ہو گئی تھی؟''

''میرا سفر ختم از مکان بالا ہو گیا ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''میں سیرِ تغافل کر کے واپس کی امید ہو گیا ہوں۔''

جواز

افسر: ''تم اس مہینے میں چار چھٹیاں لے چکے ہو۔ ایک مرتبہ تم اپنی بیوی کو ٹرین میں سوار کرنے گئے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ساس کے جنازے میں گئے تھے۔ ایک مرتبہ تمہاری بیٹی کی سالگرہ تھی اور ایک مرتبہ تمہارا لڑکا بیمار ہو گیا تھا، آج پھر چھٹی کی درخواست لے آئے ہو...... یہ کس لیے؟''

ملازم نے کہا۔ ''سر آج میری شادی ہے۔''

گپ

ایک گپی اپنے دوست کے گھر گیا اور کہنے لگا۔

''ہمارے شہر میں پاؤ بھر کے جامن ہوتے ہیں۔''

دوست نے کہا۔ ''یار ہوتے ہوں گے فی الحال تو آپ ہمارے گھر کے انگور کھائیں اور وہ جا کر اندر سے دو تربوز لے آیا۔''

اب سمجھ میں آیا کہ استاد یہ فرما رہے ہیں کہ وہ سیر کر کے واپس آ چکے ہیں۔ ''حد ہو گئی۔ آپ اکیلے اکیلے افریقا کی سیر سے واپس بھی آ گئے؟''

''افریقا نہیں بلکہ دراندمان کھارادر اور میٹھادر۔'' استاد نے انکشاف کیا۔

''کیا مطلب، کیا آپ کھارادر اور میٹھادر کی سیر کے لیے گئے تھے۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں اور اب سفرنامہ کھارادر اور میٹھادر کو ستم ایجاد کرنا ہے۔'' استاد نے فرمایا۔

''آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے استاد۔''

''اب کل صبح سے سراسر کاغذی ہو جاؤ۔'' استاد نے کہا۔ ''پھر ماجرائے کل بہ عندلیب افشا ہو جائے گا۔'' اتنا تو آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کل سے لکھنا شروع کر دوں پھر سارے حالات خود بخود ظاہر ہو جائیں گے۔ مجھ پر جھنجھلاہٹ تو سوار تھی لیکن ساری بات جاننے کے لیے استاد کا حکم ماننا ضروری تھا لہٰذا میں اگلی صبح کاغذ قلم لے کر استاد کے پاس پہنچ گیا۔ استاد نے

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

بالائی والی چائے اور بسکٹ کا انتظام کر رکھا تھا۔

''چلو لکھو بہ عنوان سفر کھارادر اور میٹھادر۔'' استاد نے فرمایا۔ ''یہ دنیا پابہ دوش وجۂ زنجیر کلاں ہے۔ گوسفند ہے خورسند ہے۔''

''خدا کے لیے استاد یہ تو سوچیں آپ کا یہ سفرنامہ کون سمجھے گا۔'' پھر استاد نے فرمایا کہ وہ یہ سفرنامہ کسی کے سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ اپنی تسکین کے لیے لکھوانا چاہتے ہیں۔

''خیر... چلیں بتائیں کیا لکھنا ہے؟'' میں نے گہری سانس لی۔

''میں مناظر ہائے صہبا میں مبتلا ہوں۔'' استاد نے بولنا شروع کیا۔ ''دونوں جانب آرامیدۂ حسینانِ کھارادر ہیں کہ آواز ہائے جن کی کرخت اور چال بھونڈی ہے کہ جو خرید رہی ہیں آلو چھولے اور دہی بڑے۔ فکرِ معاش دانہ رسیدہ مبتلائے شاہ عالم ہوتا جارہا ہے۔ دکانیں گوسفل اور مورچھل ہیں۔''

''استاد یہ دکانیں گوسفل اور مورچھل کیسے ہو گئیں؟'' میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے پوچھا۔ اس پر استاد ناراض ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس طرح ٹوک ٹوک کر ان کے خیالات کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہوں۔''

''ایک صراطِ مستقیم اس علاقے سے بہ محلہ ٹاور کو جاتا ہے۔'' استاد نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''یہاں کے افراد چیدہ شنیدہ بہت ہی نازک انداز ہیں۔ چائے اس کی بہت اچھی تھی پھر نظر آئی ایک دوشیزہ خوب رو پیوندِ اصفہان اور گورِ غریباں ہو رہی تھی۔''

خدا کی پناہ یہ میرا ہی جگرا تھا کہ میں اس قسم کی تقریر لکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ استاد کیا فرما رہے ہیں اور یہ کیسا سفرنامہ ہے۔ بہرحال یہاں تک بات سمجھ آگئی تھی کہ استاد کو بقول ان کے ایک دوشیزہ دکھائی دے گئی تھی اور استاد نے اس دوشیزہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔

استاد نے اس کے آنسوؤں کی شان میں فرمایا۔

''وہ آنسو نہیں درفشنی تھے۔ ظلم الابدان تھے، خاک دان تھے ایسا گوہر یکہ دانہ و دلفریب ساکنانِ کوچہ شیخ اور ملک ہوا کرتا ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ اس دوشیزہ کے آنسو ایسے تھے کہ شیخ اور ملک اپنی جانیں قربان کر دیں۔ (کم از کم میں تو یہی سمجھا تھا) پھر استاد اس دوشیزہ کے پاس پہنچ گئے اور اس سے دریافت کیا۔

''اے چشمک افروز کیا افتادِ دلبراں ہے تیرے ناوک پر۔''

اس لڑکی یا عورت نے حیران ہو کر استاد کی طرف دیکھا۔ ظاہر ہے استاد کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آسکی ہو گی۔

استاد نے کہا۔ ''مانع ترکِ نظارہ ہے تیری آنکھیں کہ جن میں قطرۂ گوہر شاہی رواں ہے۔''

''آپ یہ سب کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اس وقت استاد کو احساس ہوا کہ ان کی زبان کچھ زیادہ ہی جناتی ہو گئی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بات آسان کی۔ ''ان آنسوؤں کا سبب کیا ہے۔ کیا ماجرائے دلِ فگار ہے۔'' اس لڑکی یا عورت کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی۔ اس نے کہا تو کچھ بھی نہیں بس ایک آہ بھر کر آگے بڑھ گئی۔ اس آہ نے استاد کو بے قرار کر دیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔

استاد کا کہنا تھا۔ ''اس طرح میں واقفِ رموز میٹھادر ہو گیا کہ گلیاں اور چوبارے بہ حشمت کم خواب ہوتے جارہے تھے۔'' یعنی اس لڑکی کا تعاقب کرتے ہوئے انہیں میٹھادر کی گلیاں یاد ہوتی چلی گئیں پھر وہ لڑکی ایک خستہ مکان کے پاس پہنچ کر رک گئی اور اس نے استاد سے پوچھا۔ ''اے مردِ نیم افرز۔ تیرا یہ پیچھا برہمدردی خاچکائے سگاں ہے کہ میرا سینہ اشکبار اور بے قرار ہو گیا ہے۔'' سمجھ گئے ہوں گے کہ استاد کیا فرما رہے تھے۔ اس لڑکی نے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بڑے میاں تمہاری یہ جناتی زبان سمجھ میں نہیں آرہی ہے لیکن اتنا ضرور احساس ہو رہا ہے کہ تم ہمدرد انسان ہو۔''

اس پر استاد لہک کر بولے۔ ''میں ماورائے پری پیکر ہوں اولادِ آدم سے نسبت برخواست ہوں میں۔ مجھے اندازۂ تلاطم مت کر اور ماجرائے دل پذیر کو سرفراز کر۔'' مختصر یہ کہ وہ عورت استاد کو اپنے گھر میں لے گئی۔ اس گھر میں اس عورت کے چار بچے تھے۔ چھوٹے چھوٹے اور وہ سب بھوکے تھے۔

کہانی کچھ یوں تھی اس عورت کے خاوند کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ دوائیں پیک کرنے والی ایک فیکٹری میں

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com

کام کرتی تھی۔ وہ دکان کے پاس کھڑی ہو کر اس لیے آنسو بہا رہی تھی کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کھلونے خرید سکے۔ کھلونے تو بہت دور کی بات ہے وہ انہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھلا سکتی تھی۔

اس عورت کی یہ کہانی استاد کے دل کو لگ گئی۔ انہوں نے اس عورت کے ساتھ خود بھی آنسو بہانے شروع کر دیے۔ ''صبر کرو کہ قدرت فرہنگ آصفیہ ہوتی ہے۔'' استاد نے کہا۔ ''پیکرِ قلزم کو جان نثار کرو۔'' بہرحال اس عورت کی سمجھ میں استاد کی بات آئی ہو یا نہ آئی لیکن جب استاد نے اسے دو ہزار روپے نکال کر دیے تو حیرت سے اس کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ''دو ہزار یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ یہ آپ مجھے کیوں دے رہے ہیں؟''

''طفلانِ خواہش شد کے لیے۔'' استاد نے بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

اس عورت کی آنکھوں میں خوشیوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے اسی وقت کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا اور استاد سرشار وہاں سے واپس آ گئے۔

اس کے بعد استاد نے یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ وہ روزانہ اس کے پاس جانے لگے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اس عورت کے لیے اسی علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان کا بندوبست کر دیا تھا جس پر استاد کے تیس ہزار روپے خرچ ہو گئے۔

''خدا کی پناہ استاد۔'' میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''یعنی آپ نے افریقا کے سفر کے لیے جو پیسے جمع کیے تھے وہ اس عورت کو دے دیے؟''

''ہاں بھائی۔'' استاد مسکرا دیے۔ سفرِ بخیر تمام شد۔ باری کو دکان میٹھار درکھار ادر۔''

''اس عورت نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے استاد۔''

استاد نے بے نیازی سے کہا۔ ''تم مقدارِ آنسوؤں کی بے بسی سے واقفِ طالوت نہیں ہو۔'' یعنی میں لوگوں کی بے بسی اور ان کے آنسوؤں سے ابھی واقف نہیں تھا اور وہ عورت مظلوم تھی۔ استاد یہ سب کہتے رہے اور میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس عورت کا پول ضرور کھولوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے استاد سے کہا۔

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ نومبر 2011ء کی جھلکیاں

گلِ تازہ

اس مصنف کی داستانِ حیات جسے مسلمان ہونے کی وجہ سے دہلی میں اترنے کی اجازت نہ ملی جبکہ لندن کا ادبی حلقہ اسے پوجتا تھا

راکھ کا آسیب

اس سانحے کا ذکر جس نے آدھے یورپ کی معیشت کو ہلا دیا تھا

ڈائری

ایک ایسی آپ بیتی جو آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی

اس کے علاوہ

''فلمی الف لیلہ'' فلم دنیا کی کہی ان کہی باتیں یادیں، ''سراب'' ایک ایسی طویل سرگزشت جو پڑھنے والوں کو اسیر کر لیتی ہے، ''امریکا او امریکا'' انتہائی دلچسپ سفر کہانی، ساتھ میں بہت سی سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، سچے قصے اور بھی بہت کچھ

بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں

پھر آپ خود گرویدہ ہو جائیں۔

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

"استاد آپ مجھے بھی اس کے پاس لے چلیں میں بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم ضرور کوئی آسیان خود کلام کرو گے۔" استاد نے کہا۔

"نہیں میں کچھ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "صرف اس سے ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رختِ بے آبرو کرو۔" استاد نے فرمایا۔ "یعنی میرے ساتھ چلو۔"

وہ ایک موٹی کالی سی عورت ثابت ہوئی تھی جس کی آنکھوں سے چالاکی ظاہر ہو رہی تھی۔ استاد نے اس کے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا وہ سلیقے کا کوارٹر نما مکان تھا۔ استاد نے تو اس کے حسن کی تعریف میں قلابے ملا دیے تھے جب کہ وہ ایک انتہائی بدصورت عورت تھی۔

"استاد کیا یہی ہے وہ...... آپ نے جس کے حسن کی تعریف کی تھی؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"ہاں تم اندرونِ دل کو غائر کرو۔" استاد نے فرمایا۔ "حسن سطحِ آب پر رواں نہیں رہتا۔" مطلب یہ کہ میں اس کے دل کو دیکھوں اس کی صورت پر توجہ نہ دوں۔

ظاہر ہے اب استاد سے کیا بحث کر سکتا تھا۔ اسی لیے دانت پیس کر رہ گیا۔ استاد نے بڑے سلیقے سے ...... میرا تعارف کروایا۔ وہ ہماری خاطر تواضع میں بچھی جا رہی تھی۔ اس کی ہر بات سے مکاری اور چالاکی کا اظہار ہو رہا تھا۔

بہرحال اس دن میں صرف اس عورت کو دیکھ کر اور اس سے ملاقات کر کے واپس آ گیا۔ دوسرے دن میں استاد کو بتائے بغیر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا استقبال کیا۔ "آج وہ نہیں آئے آپ کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں میں اکیلا آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک بے وقوف آدمی ہیں۔ ان کے سامنے ہم کھل کر بات نہیں کر سکتے تھے۔"

"جی!" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"دیکھو...... میں بھی اس لائن کا ہوں۔" میں نے کہا۔ "فرق یہ ہے کہ تم عورت ہو اور میں مرد ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"صاف بات یہ ہے کہ استاد بہت دولت مند آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "سیکڑوں ایکڑ زمینیں ہیں ان کے پاس۔ حیدر آباد میں اپنی کئی دکانیں ہیں جن کا ہر مہینے کرایہ آتا ہے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔"

"لیکن انہوں نے تو یہ سب نہیں بتایا۔"

"چالاک آدمی ہے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں بتائے گا۔ یہ تو میں جانتا ہوں دو سال سے اس کے ساتھ ہوں۔ میرے سارے خرچے وہی اٹھاتا ہے۔ ہر مہینے پانچ ہزار وصول کرتا ہوں اس سے۔"

"اچھا۔" اس کی آنکھیں اور بھی چمک اٹھیں۔

"اسی لیے میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ تم اگر میرا ساتھ دو تو ہم دونوں مل کر اس سے دو تین لاکھ روپے اینٹھ سکتے ہیں۔"

"دو تین لاکھ۔" اس کا جیسے دم ہی نکل گیا۔

"ہاں لیکن آدھا آدھا ہو گا۔ فرض کرو ڈیڑھ لاکھ بھی مل گئے تو تمہارے لیے بہت ہیں ساری زندگی گزار لو گی۔ اپنے مکان کے آگے کوئی دکان کھلوا لینا۔ آرام سے کھاتی رہنا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ فوراً ہی ساتھ دینے تیار ہو گئی۔ "یہ بتاؤ کہ اس سے پیسے کیسے نکلواؤں گی؟"

"میٹھی میٹھی باتیں کر کے۔" میں نے کہا۔ "وہ تمہارے جال میں تو پھنس ہی چکا ہے۔ تھوڑی سی اور محنت کر لو۔ اس پر اپنی محبت نچھاور کر دو۔ ویسے بھی وہ عورت کے پیار کا بھوکا ہے بلکہ ہو سکے تو اس سے شادی کی بات کر لو پھر وہ اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پر لا کر ڈھیر کر دے گا۔"

"ڈیڑھ لاکھ کے لیے تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"بس تو پھر تیار رہو۔ میں اس بے وقوف کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔"

میں نے استاد کو پکڑا۔ "استاد میں نے کہا تھا نا کہ وہ عورت تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ تمہارے سارے پیسے اس نے اپنی مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر تم سے وصول کر لیے ہیں۔"

"نہیں یہ الزام بے دھڑک ہے۔" استاد نے تردید کی۔ "وہ ایک خوش دامن عورت ہے۔" استاد شاید پاک دامن کہنا چاہتے ہوں گے۔ پھر میں نے استاد کو

WAQAR AZEEM www.pakistanipoint.com

اپنی ملاقات کا سارا احوال بتاتے ہوئے کہا۔

''استاد اب تم جاؤ گے نا تو وہ تم سے لگاوٹ کی بات کرے گی اور شادی کا مطالبہ کرے گی کیونکہ میں اسے یہ سکھا کر آیا ہوں۔ آزمانا چاہو تو ابھی چلے جاؤ۔'' استاد کچھ دیر کے لیے بجھ کر رہ گئے پھر وہ اس عورت کے پاس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

''ٹھیک ہے۔ میں درافشاں کر کے آتا ہوں۔ اگر اس ناہنجار نے یہ فیض التفات فرمایا اور عقد ثانی مذکورہ کی پیش قدر افزائی کی تو میں اس کا گریبان حشر تار تار کردوں گا۔''

''ہاں استاد...... تمہیں یہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ جس نے چاہا تمہیں بے وقوف بنا کر تم سے پیسے اینٹھ لیے۔'' استاد اس عورت سے نمٹنے کے لیے چلے گئے۔

ان کی واپسی بہت دیر کے بعد ہوئی تھی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کیا خبر لے کر آتے ہیں۔ استاد واپس آئے تو بہت اداس دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا

''تمہارا گمان اغلب اشک بار تھا۔ اس نے سمند ناز کو گنجینہ کر دیا۔ اس نے بہ نگاہِ لطف کرم مجھ سے شادی کی دل افروز کی باتیں کیں۔ جیسا تم نے کہا تھا۔''

مطلب یہ تھا کہ اس عورت نے استاد سے پیار کی باتیں کرنے کے بعد ان سے شادی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ استاد شدید صدمے میں تھے۔ انسان پر سے ان کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ وہ بار بار بولے چلے جا رہے تھے۔ ''بس یہی افتاد بے لگام ہے۔ بس یہی تازیانہ ہے۔ میں تو برباد ہوگیا۔ دولت ہائے سخن دوراں سے محروم تمنا ہوگیا۔''

مراد یہ کہ وہ برباد ہو گئے۔ ان کے سارے پیسے دھوکے سے ہتھیا لیے گئے۔ استاد بار بار یہ کہہ رہے تھے کہ اب وہ اس عورت کو نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے ان کو اور بھی شہ دی۔ ''اور کیا استاد! اس دھوکے باز کو مت چھوڑنا پیسے حرام کے نہیں تھے۔ تم چلو میرے ساتھ۔ ہم دونوں مل کر اس کی ایسی کی تیسی کر دیں گے۔ ہوسکا تو پولیس کی مدد بھی لی جائے گی۔''

جس گلی میں استاد کا قیام تھا اس گلی میں راجا نام کا ایک غنڈا رہا کرتا تھا۔ راجا کو استاد سے بہت محبت تھی۔ وہ استاد کے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار تھا۔ استاد نے کئی مواقع پر اس کی بہت مدد کی تھی۔

میں نے اس عورت کے بارے میں راجا کو سب کچھ بتا دیا۔ یہ کہانی سنتے ہی راجا طیش میں آ گیا۔ ''اس کی ایسی کی تیسی استاد جیسے آدمی کے ساتھ دھوکا۔ آپ لوگ چلیں۔ میں اس عورت کا سارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہوں۔ گھر سے نکال دوں گا اسے۔ صرف پانچ منٹ لگیں گے۔''

طے یہ پایا کہ اگلی صبح اس عورت کے گھر پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ میں، استاد، راجا اور اس کے دو تین بندے اور ہوں گے لیکن دوسری صبح جب یہ پروگرام کے مطابق استاد کے پاس پہنچا تو استاد نے جانے سے انکار کر دیا۔

''نہیں بھائی یہ التزام نامناسب ہوگا۔ وہ شرمندہ دجال اور قتال ہے۔ اوج ثریا ہے، زہرہ بدن اور مادر پسران خورسند ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا بولے چلے جا رہے ہیں؟''

''اس عورت کو مباہلہ مت کرو۔'' استاد نے کہا۔ ''چہرۂ بے نور پر آتش فشانی شب سمند بے جا ہونا مجھے دخترانِ مشرق سے اچھا نہیں لگے گا۔''

بہت دیر کی تقریر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ استاد میرے اور راجا کے ساتھ اس عورت کا فراڈ پکڑ لیتے لیکن اس وقت اس عورت کے چہرے پر جو شرمندگی ہوتی استاد وہ شرمندگی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے اس عورت کو یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا کہ اس عورت نے جو کچھ کیا ہے وہ اپنے بچوں کے لیے کیا ہے اور وہ اس کے بچوں کو بے گھر ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔

خدا کی پناہ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس بغیر پڑھے لکھے انسان نے دو منٹ میں انسانیت کا سارا فلسفہ سمجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے عقیدت سے استاد کا ہاتھ تھام لیا۔ ''استاد تم بہت بڑے آدمی ہو۔''

''اچھا، اچھا۔'' استاد ہنس دیئے۔ ''آج سے پھر لخت لخت کرنے والا ہوں تاکہ سفرنامۂ افریقا تکمیلِ انتظار کو پہنچ جائے۔''

''زندہ باد استاد۔'' میں نے نعرہ لگایا۔ ''تمہارا سفرنامہ ضرور مرتب ہوگا۔''

●●●

WAQAR AZEEM
www.pakistanipoint.com